محبتِ رسول
رُوحِ ایمان
شیخ الاسلام علامہ سیّد
محمّد مدنی اشرفی جیلانی
جانشین حضور محدثِ اعظم ہند کچھوچھہ شریف
دارُ فیض گنج بخش لاہور

محبتِ رسول روحِ ایمان

شیخ الاسلام علامہ سید محمد مدنی اشرفی جیلانی

جانشین حضور محدثِ اعظم ہند کچھوچھہ شریف

حسبِ فرمائش

محمد یحییٰ انصاری اشرفی ریاض، سعودی عربیہ

دارالفیض گنج بخش

55- حکیم محمد موسیٰ امرتسری روڈ (ریلوے روڈ گوالمنڈی) حضرتِ لاہور

سلسلہ اشاعت نمبر ۵۱

مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام

کتاب ------ محبتِ رسول ﷺ روح ایمان
مؤلف ------- شیخ الاسلام علامہ سید محمد مدنی اشرفی جیلانی
ناظم اشاعت ------ میاں محمد ریاض ہمایوں سعیدی
اہتمام --------- حکیم محمد سلیم مرتضائی
تعداد ----------- گیارہ سو
سن اشاعت -------- ذی الحجہ ۱۴۳۲ھ نومبر ۲۰۱۱ء
ہدیہ ---- ایصال ثواب امت رسول اللہ ﷺ

ملنے کے پتے

دار الفیض گنج بخش

☆ 55۔ حکیم محمد موسیٰ روڈ (ریلوے روڈ) حضرتِ لاہور
فون: 042.37671389

☆ حکیم محمد سلیم مرتضائی، مرتضائی دواخانہ، بالمقابل جامع مسجد اسلامیہ کالج
سرگودھا روڈ۔ فیصل آباد

☆ فیض گنج بخش بک سنٹر۔ دربار مارکیٹ۔ داتا دربار، لاہور

بیاد

حضرت شیخ سید علی بن عثمان ہجویری معروف بہ داتا گنج بخش لاہوری قدس سرہ العزیز جنہوں نے برصغیر ہند میں ۱۰۴۱ تا ۱۰۷۱ عیسوی میں اسلامی تعلیمات کو پھیلایا۔ ان کا در فیض آج بھی کھلا ہوا ہے۔ نیاز مندان داتا گنج بخش اپنے دامن میں گوہر مراد بھر کر لے جاتے ہیں اور اپنی زبان قال و حال سے یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

گنج بخش فیض عالم مظہر نور خدا
ناقصاں را پیر کامل کاملاں را رہنما

بفیضان نظر

لاہور کے ''مستور الحال'' درویش حکیم اہل سنت حکیم محمد موسیٰ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ جنہوں نے عشق رسول ﷺ کا علم تھامے رکھا، محبت رسول کی شمع کو روشن رکھا، فکر رضا کو ایک عالمی تحریک بنایا، کتاب کی خوشبو کو پھیلا کر علم و عرفان کو عوام و خواص تک پہنچایا۔ فیض موسوی آج بھی جاری ہے۔ تلاش و جستجو کے متوالے ان کے مخزن علم سے برابر مستفید ہو رہے ہیں:

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

کتاب ہذا حکیم اہل سنت حکیم محمد موسیٰ
امرتسری علیہ الرحمۃ کے بارہویں سالانہ
عرس مبارک ذی الحجہ ۱۴۳۲ھ نومبر ۲۰۱۱ء
کے موقع پر تقسیم کی جا رہی ہے۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

عَنْ اَنَسٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِنْ وَّالِدِہٖ وَ وَلَدِہٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ ○

(مُتَّفَقٌ عَلَیْہِ)

حضرت انس رضی اللہ تعالےٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسُول اللہ صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ تم میں سے کوئی مومن ہو نہیں سکتا۔ یہاں تک کہ میں اُسے اس کے ماں باپ، اس کی اولاد اور سب لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہوجاؤں۔

(بخاری و مُسلم)

جواہر پارے

(۱) مومن کامل کے ایمان کی نشانی اور پہچان یہ ہے کہ اس مومن کے نزدیک رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم تمام چیزوں اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب و معظم ہوں گے، خواہ وہ باپ یا بیٹے ہوں جن سے طبعاً محبّت ہوتی ہے —— یا —— وہ دوسرے لوگ ہوں جن سے طبعاً محبت ہو —— یا —— اختیاراً محبت کی گئی ہو۔

(۲) محبت کی دو قسمیں ہیں —— ایک جبلّی اور طبعی —— اور دوسری اختیاری۔

جبلّی محبت —— ؟ جو بندہ کے اختیار سے باہر ہو اور اس کی طبیعت و جبلّت کا تقاضہ ہو۔

"اختیاری محبت" —— ؟ جس میں بندہ کے اختیار کو دخل ہو اور اس میں تکلیف جاری ہو سکے۔

اس مقام پر محبت کی پہلی قسم خارج از بحث ہے اس لئے کہ حدیث زیرِ شرح میں کلام ایمان سے متعلق ہے۔ جس کی تحصیل و تکمیل کی تکلیف شریعت کی طرف سے ہے۔

(۳) یہاں "احبیّت" سے مراد یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق کی ادائیگی کو دوسروں کے حقوق کی ادائیگی پر ترجیح دی جائے۔

—— باین طور کہ —— آپ کے دینِ پاک کو زندگی کے ہر ہر شعبے میں لازمی طور پر اپنائے رکھا جائے، آپ کی سُنّت کی اتباع کی جائے، آپ کی بارگاہِ قُدس کے آداب کا پُورا لحاظ رکھا جائے اور آپ کی رضا کو زندگی کا نصب العین بنا لیا جائے۔ یہاں تک کہ اگر آپ کی محبت کا تقاضہ یہ ہو کہ اپنی جان کو قربان کر دیا جائے —— یا —— اپنے چہیتے بیٹے اور شفیق باپ، نیز کسی محبوب شخص یا محبوب و پسندیدہ چیز سے بالکلیہ علیحدگی اختیار کر لی جائے تو اس میں بھی کوئی تأمل نہ کیا جائے، جیسا کہ اجلّہ صحابہ کرام نے کر کے دکھا دیا۔

(۴) حدیث زیرِ شرح میں "نفس" کا ذکر نہیں ہے جیسا کہ اس دُعائے ماثور میں ہے جس میں حق تعالےٰ کی محبت کی درخواست کی گئی ہے وہ دُعا یہ ہے:

اَللّٰهُمَّ اجعل حبّك احبّ اليّ مِنْ نفسي و مَالي و وَالدي۔

اے اللہ! مجھ میں اپنی محبت کو میری جان، میرے مال اور میرے بیٹے کی محبت پر غالب فرما دے۔

اب حدیث زیرِ شرح میں "نفس" کا ذکر نہ فرمانا —— ممکن ہے کہ اس لئے ہو، تاکہ تعلیم و تربیت میں تدریج و ترتیب کی رعایت ہو جائے۔ اوّلاً نبی کریم کو باپ بیٹے سے زیادہ محبوب بنا لینے کی تکلیف دی جائے۔ جب انسان اس مقام پر آجائے تو پھر اُسے آپ کو جان سے زیادہ محبوب بنا لینے کی راہ دکھائی جائے —— جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے:

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم از عمر رضی اللہ عنہ پُرسید کہ حال چیست ؟ مارا دوست داری و بس یا غیر مارا۔ نیز شریک می گردانی ؟ گفت کہ محبت مشترک است۔ شمارا دوست می دارم و نفس را و فرزندان و مال و منال را نیز دوست می دارم۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دستی بر سینۂ عمر زد و تصرّفی کرد و پرسید اکنوں حال چیست و چگونہ می دریابی ؟ گفت ساقط شُد محبتِ اہل و مال، و امّا محبتِ نفس ہنوز باقی است۔ بارِ دگر دست بر سینۂ عمر زدُ و پُرسید اکنوں چگونہ ؟ گفت ہمہ ساقط شد و نماند اِلّا محبتِ تو یا رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم۔"

(اشعۃ اللمعات)

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے پُوچھا کہ تمہارا کیا حال ہے ؟ صرف مجھی کو دوست رکھتے ہو یا میرے سوا کو بھی ؟ حضرت عمر نے عرض کیا کہ محبت مشترک ہے۔ آپ کو بھی محبوب رکھتا ہوں اور اپنی جان کو بھی، اپنے بچوں کو اور مال و دولت کو بھی۔ یہ سُن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر کے سینے پر ہاتھ رکھا اور ان کے دل پر خاص توجہ ڈال کر تصرف فرمایا اور پھر دریافت فرمایا اب کیا حال ہے ؟ اپنے کو کیسا پا رہے ہو ؟ حضرت عمر نے

جواباً عرض کیا کہ میرے دل سے اہل و مال کی محبت تو ساقط ہوگئی مگر جان کی محبت ابھی باقی ہے۔ آپ نے دوسری بار حضرت عمرؓ کے سینے پر ہاتھ رکھا اور ارشاد فرمایا کہ اب کیسے ہو؟ عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اب میرے دل میں کسی اور کی محبت نہیں رہ گئی، اب صرف آپ کی محبت ہے جو میرے دل کے ہر ہر گوشے میں سمائی ہوئی ہے۔"

(۵) محبّت و مودّت کا باعث حسن ہے یا احسان ———

اور یہ دونوں صفتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی میں بدرجۂ اتم موجود ہیں ——— المختصر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حسن و جمال، جاہ و جلال، فضل و کمال جود و نوال اور اپنے ہر ہر کمال میں درجۂ کمال تک پہونچے ہوئے ہیں۔ الغرض آپ تمام مخلوق میں اجمل و اکمل ہیں ——— اور اگر اور گہرائی میں اُتر کر دیکھا جائے اور دریائے حقیقت میں شناوری کر کے ملاحظہ کیا جائے تو یہ حقیقت کھُل کر سامنے آجاتی ہے کہ درحقیقت حسن و احسان اور جملہ صفاتِ کمال، ذاتِ خداوندی میں مقصود و منحصر ہے۔ جو کامل الصّفات اور واہبُ العطیات ہے ——— اور ——— آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خداوندی جمال و کمال کا آئینہ ہیں ——— پس اجمّیت کی نسبت خواہ ذاتِ خداوندی کی طرف کی جائے یا ذاتِ رسالت کی طرف کی جائے، دونوں صحیح ہے اور درحقیقت دونوں ایک ہی ہے۔

ہم حسن و جمال بی نہایت داری
ہم جود و کرم بحدِّ غایت داری

ہم حسن ترا مسلّم و ہم احسان
محبوب توئی کہ ہر دو آیت داری

فوائد

(۱) عن انس رضی اللہ عنہ ـــــــ یہاں انس سے مُراد حضرت انس بن مالک بن النضر الانصاری الخزرجی النجّاری ہیں۔ آپ کو دس سال تک نبی کریم کی خدمت کرنے کا شرف حاصل رہا۔ جب آپ بارگاہِ نبوّت میں حاضر ہوئے تھے اس وقت آپ کی عمر شریف ۸ سال ـــــ یا ـــــ ۹ سال ـــــ یا ـــــ دس سال کی تھی ـــــ آپ کی والدۂ محترمہ نے بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوکر آپ کے لئے خصوصی دُعا کی التماس کی تھی۔ سرکارِ رسالت نے ان کی درخواست کو قبول فرماکر آپ کے لئے اِن لفظوں میں مخصوص دُعا فرمائی :

اَللّٰھُمَّ بَارِكْ فِی مَالِہ وَ وَلَدِہ وَ أَطِل عُمرہ واغفر ذنبہ ○

اے اللہ! اس کے مال اور اس کی اولاد میں برکت عطا فرما اور اس کو عمر طویل بخشدے نیز اس کے گناہوں کی مغفرت فرما۔

اس دُعائے نبوی کی برکت سے سَو سے زیادہ آپ کی اولادیں ہوئیں اور آپ کا نخلستان سال میں دو بار میوہ دیتا رہا اور آپ کی عمر شریف سَو سال

تک پہونچ گئی، بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ رہی ——— اپنے مال و عیال اور اپنی عمر شریف میں برکت کا مشاہدہ فرماکر آپ نے ایک موقع پر اس کا اظہار بھی فرمایا اور آخر میں یہ بھی ارشاد فرمایا :

انا ارجو اللہ ابعۃ -

مجھے اُمید ہے کہ چوتھی بات بھی پوری ہوکر رہے گی -

یعنی نبی کریم کی دُعا کی برکت سے پہلی بات مال میں برکت، دوسری بات عیال میں برکت، تیسری بات عُمر میں برکت، دیکھ کر قوی اُمید ہے کہ آپ کی فرمائی ہوئی چوتھی بات یعنی "گناہوں کی بخشش" بھی ضرور ہوگی ——— عہدِ فاروقی میں لوگوں کو علمِ دین سکھانے کی غرض سے بصرہ تشریف لے گئے اور وہیں رہ گئے اور پھر بصرہ ہی میں ۹۱ھ ——— یا ۹۳ھ میں وفات پائی ——— بصرہ میں وفات پانے والے صحابہ میں آپ آخری صحابی تھے ——— آپ کی قبر پُرانوار زیارت گاہِ خواص و عوام ہے - آپ کے بے شمار مناقب ہیں - کثیر لوگوں نے آپ سے روایت کی ہے - آپ کی کُنیّت ابوحَمزۃ تھی ——— حُمزۃ ایک قسم کے زہریلے اور تیز پودے کو کہتے ہیں ——— یہ کُنیّت سرکارِ نبوّت کی عطا کردہ تھی - حضرت انس خود ہی فرماتے ہیں کہ نبی کریم نے اُسی پودے سے میری کُنیّت رکھدی، جسے ایک روز میں چُن رہا تھا اور سرکار نے چُنتے ہوئے ملاحظہ فرمالیا تھا -

---

(۲) "جواہر پارے" کے تحت جو کچھ ہے وہ سب اشعۃ اللمعات مؤلّفہ محقق علی الاطلاق شیخ عبدالحق محدّث دہلوی علیہ الرحمۃ والرضوان کا چربہ

اور اسی کا خلاصہ و حاصل ہے۔ اس سے پہلے بھی ہر ہر مقام پر جواہر پارے کے عنوان سے اشعۃ اللمعات ہی کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے اور انشاء المولیٰ تعالیٰ آئندہ بھی اس کا التزام رکھوں گا۔

(۳) ...... لَا یُؤْمِنُ الخ۔ فیوض الباری شرح صحیح البخاری میں ہے:

"تم میں کوئی مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ مجھ کو ساری کائنات سے زیادہ محبوب نہ رکھے۔ اس کا مطلب قطعاً یہی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبّت کے بغیر ایمان کا پایا جانا ناممکن ہے۔ ہر شخص جس کو اللہ تعالےٰ نے فہم و فراست کی دولت دی ہے، وہ یقین کے ساتھ جانتا ہے کہ جس کے ساتھ عقیدت و نیازمندی ایمان میں داخل ہو اور بغیر اسکے مانے آدمی مومن نہ ہو سکے، اس کی محبت ساری کائنات سے زیادہ ضروری ہو گی۔ ماں، باپ، اولاد، عزیز و اقارب کے انسان پر حقوق ہیں اور ان کا ادا کرنا لازم ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص ان سب کو بھول جائے اور اس کے دل میں ان کے لئے بالکل محبت و الفت باقی نہ رہے اور ان سب سے بے تعلق ہو جائے تو اس کے ایمان میں خلل نہ آئے گا۔ کیوں کہ ایمان لانے میں ماں باپ، عزیز و اقارب کا ماننا ضروری نہیں ہے۔ لیکن رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کا ماننا مومن ہونے کے لئے ضروری ہے۔ جب تک لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کے ساتھ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کا معتقد نہ ہو ہرگز مومن نہیں ہو سکتا۔ تو اگر اس کا رشتۂ محبت حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے ٹوٹا تو یقیناً ایمان سے خارج ہو گیا۔ کیونکہ تصدیقِ رسالت محبت کے بغیر ہو ہی نہیں سکتی۔ اس لئے اسلام

ہیں حضور اکرم علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کی محبت کو سارے عالم سے زیادہ ضروری اور اسلام و ایمان کی شرط اوّل قرار دیا گیا۔"

(۴) ...... لا یؤمن الخ ——— مراۃ شرح مشکوٰۃ مؤلفہ جلالۃ العلم حکیم الامت مفتی احمد یار خاں صاحب نعیمی اشرفی علیہ الرحمۃ والرضوان میں ہے :

" یہاں پیار سے مراد طبعی محبوب ہے نہ کہ صرف عقلی، کیوں کہ اولاد کو ماں باپ سے طبعی اُلفت ہوتی ہے، یہ ہی محبّت حُضور سے زیادہ ہونی چاہئے اور بحمدہٖ تعالےٰ ہر مومن کو حُضور جان و مال اور اولاد سے زیادہ پیارے ہیں۔ عام مسلمان بھی مُرتد اولاد، بے دین ماں باپ کو چھوڑ دیتے ہیں اور حُضور کی عزت پر جان نچھاور کر دیتے ہیں۔ غازی عبد الرشید، غازی علم دین، عبد القیوم وغیرہ کی زندہ جاوید مثالیں موجود ہیں ——— " جواہر پارے " کے تحت حضرت شیخ محقق کا ارشاد صاف لفظوں میں گذر چکا ہے کہ حدیث زیر شرح میں محبت سے مراد عقلی محبت ہے نا کہ طبعی محبت ——— مرقات میں حضرت ملا علی قاری فرماتے ہیں :

لیس المراد الحب الطبیعی لانہ لا یدخل تحت الاختیار ولا یکلف اللہ نفسا الّا وسعھا بل المراد الحب العقلی الذی یوجب ایثار ما یقتضی العقل رجحانہٗ ویستدعی اختیارہ وان کان علی خلاف الھوی کحب المریض الدواء فانہ یمیل الیہ باختیارہ ویتناول

بمقتضی عقله لما علم وظن ان صلاحه فیه وان نفر عنه طبعه مثلا لو امره صلی اللہ علیه وسلم بقتل ابویه واولاده الکافرین أو بان یقاتل الکفار حتی یکون شهیدا لاحب ان یختار ذلک لعلمه ان السلامة فی امتثال امره صلی اللہ علیه وسلم اؤ المراد الحب الایمانی الناشی عن الاجلال والتوقیر والاحسان والرحمة وهو ایثار جمیع اغراض المحبوب علی جمیع اغراض غیره حتی القریب والنفس ولما کان صلی اللہ علیه وسلم جامعا لموجبات المحبة من حسن الصورة والسیرة وکمال الفضل و والاحسان مالم یبلغه غیره استحق ان یکون احب الی المومن من نفسه فضلا عن غیره سیما و هو الرسول من عند المحبوب الحقیقی الهادی الیه والدال علیه والمکرم لدیه ٥

"یہاں محبّت سے مُراد طبعی محبت نہیں، اس لئے کہ حُبِّ طبعی اختیار سے خارج ہے اور اللہ کسی نفس کو تکلیف نہیں دیتا مگر اُسی چیز کی جو اُس کے اختیار میں ہو — بلکہ مُراد عقلی محبت ہے جو ان امور کو اپنا لینے کی موجب ہے،

جن کی طرف عقلی رُجحان ہو۔ اور جسے اختیار کرنے کی عقل داعی و متقاضی ہو خواہ وہ خواہش کے خلاف ہی کیوں نہ ہو، جیسے "مریض کی دَوا، سے محبت"۔ اس لئے کہ دوا کی طرف مریض کا میلان اس کے اختیار سے ہے جو اس کی عقل کا تقاضہ ہے۔ کیوں کہ اُسے اچھی طرح معلوم ہوچکا ہے اور گمان غالب ہوچکا ہے کہ اس کی بھلائی اسی میں ہے، اگرچہ اس کی طبیعت کو اس سے نفرت ہے ——— مثلاً ——— حضور صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم اگر کسی کو حکم دیں کہ وہ اپنے کافر ماں باپ اور بچوں کو قتل کردے ——— یا ——— یہ کہ کُفّار سے یہاں تک لڑے کہ خود شہید ہوجائے تو وہ اسی کو اپنانے کو پسند کرے اور اسی کو اختیار کرنا محبوب رکھے اسلئے کہ اسے علم ہے .... کہ سلامتی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی بجا آوری ہی میں ہے۔

ایک امکان یہ بھی ہے کہ حدیث پاک میں حُب سے مُراد حُبِّ ایمانی ہو جو اجلال و توقیر اور احسان و رحمت کی پیداوار ہے اور وہ یہ ہے کہ محبوب کی ہر غرض کو اس کے غیر کی ہر ہر غرض پر ترجیح دی جائے اور محبوب کے تمام اغراض کو اپنا لیا جائے اور اسے ملحوظ خاطر رکھا جائے۔ محبوب کا غیر، خواہ کوئی قریب ترین عزیز ہو یا خود اپنی جان ہو۔ اور جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم محبت کے تمام موجبات مثلاً

حُسن صورت، حُسن سیرت، کمال فضل اور احسان کے جامع ہیں اور ان تمام خوبیوں میں اس مقام رفیع پر جلوہ فرما ہیں، جہاں تک آپ کے غیر کی پہونچ نہیں تو آپ زیادہ مستحق ہیں کہ مومن کو اپنے سے بھی زیادہ محبوب ہوں، چہ جائیکہ اس کے غیر سے۔ اور جب خاص کر کے یہ حال ہو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جملہ انسانی خوبیوں کے ساتھ ساتھ محبت حقیقی خالق کائنات اللہ ربّ العزّت کے بھیجے ہوئے ہیں جو بارگاہِ خداوندی کی طرف ہدایت فرماتے ہیں، اس کی طرف راہ دکھاتے ہیں۔ اور خدائے تعالےٰ کی بارگاہ میں مکرّم و معظّم ہیں۔"

مرقات کی عبارت کے ساتھ ساتھ اس کا مطلب خیز ترجمہ تحریر کر دیا ہے تاکہ ہر خاص و عام اچھی طرح فائدہ حاصل کر سکے ——

اشعۃ اللمعات اور مرقات کے علاوہ دوسری معتبر کتابوں میں بھی اس بات کی تصریح ملتی ہے کہ حدیث زیر شرح میں محبّت سے حُبّ عقلی ہی مُراد ہے نہ کہ حُبّ طبعی —— مثلاً —— فتح الباری ج ۱- ص ۴۵ میں علامہ ابن حجر عسقلانی رقم طراز ہیں:

والمراد بالمحبة هنا حب الاختيار لا حب الطبع قاله الخطابی ٥

" خطابی نے کہا ہے کہ یہاں محبت سے مُراد حُبّ اختیاری ہے نہ کہ حُبّ طبعی۔"

زرقانی شرح مواہب ج ۶ ص ۲۴۳ میں ہے :

(قال الخطابی والمراد بالمحبۃ ھنا حب الاختیار) الذی یقتضی العقل ایثارہ وان خالف الطبع کمحبۃ المریض الدواء (لاحب الطبع) الذی لا یدخل تحت اختیار فانہ لا یؤاخذ بہ لعدم دخولہ تحت استطاعتہ ٥

"خطابی نے کہا ہے کہ یہاں محبت سے حُبِّ اختیاری مُراد ہے جس کو اپنانے کی عقل داعی ہو۔ اگرچہ طبیعت کو ناگوار ہو، جیسے کہ مریض کی محبّت دوا سے۔ یہاں حُب سے حُبِّ طبع مُراد نہیں، جو انسانی اختیار کے ماتحت نہیں کیوں کہ استطاعت کے دائرے میں داخل نہ ہونے کے سبب اس پر کسی طرح کا مواخذہ نہیں۔"

اشعۃ اللمعات، مرقات، فتح الباری اور زرقانی کی مذکورہ بالا عبارتیں اس بات کو واضح کر رہی ہیں کہ محبت کی دو قسمیں ہیں :

۱۔ حُبِّ طبعی۔

۲۔ حُبِّ عقلی بلفظِ دیگر حُبِّ اختیاری۔

مرقات میں حُبِّ ایمانی فرما کر جو حُب کی ایک تیسری قسم کی طرف اشارہ کیا ہے غور فرمائیے تو وہ الگ سے کوئی قسم نہیں بلکہ مذکورہ بالا دونوں قسموں میں سے کسی ایک کی فرع ہے ـــــــ ان تصریحاتِ مذکورہ بالا کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے آئیے اس ناچیز کے معروضات پر غور فرمائیے۔

میں نے جہاں تک غور و فکر کیا ہے، یہ "عقلی محبت" میری سمجھ میں نہ آسکی۔ میرے خیال میں محبت صرف طبیعت کے میلانِ صحیحہ کا نام ہے جس کا آغاز دل کے تعلق سے ہوتا ہے، پھر اس تعلق کو عزم و ارادہ مضبوط بناتا ہے جس کے بعد قدرتی اور فطری طور پر ایک کشش پیدا ہوتی ہے۔ جو مُحِب کو محبوب کی طرف کشاں کشاں لے جاتی ہے۔ اس کے بعد چاہنے والے کے دل میں ایک قائم رہنے والی عشقیہ سوزش اور جلن کا ظہور ہوتا ہے جو آگے بڑھ کر پیار کا رُوپ اختیار کر لیتا ہے۔ اور دل کو صفت و داد کی کامل معرفت ہو جاتی ہے اور پھر اس کے آگے کی منزل میں محبت کا اثر دل کی گہرائی تک پہونچ جاتا ہے، اس صورت میں چاہنے والے پر ایک ایسا شغف مُسلّط ہو جاتا ہے کہ وہ شب و روز تدابیر قرُب اور مواصلات وصل کی درستگی میں لگا رہتا ہے۔ اسے اگر کوئی فکر ہوتی ہے تو صرف محبُوب کی فکر ہوتی ہے، محبُوب کے سوا باقی تمام تفکّرات کا انقطاع ہو جاتا ہے۔ ایک طرف محبوب ہی کا تصور ہے جسم پر جس کی شہنشاہی ہے تو دوسری طرف محبوب ہی کی محبت ہے دل پر جس کی حکمرانی ہے ——— یہ کیفیت و حالت جب اور ترقی کرتی ہے تو ایک ایسی حالت کا ظہور ہوتا ہے، جس کی تعبیر عشق سے کی جاتی ہے۔ یہ عشق کا مرض ایک ایسا مرض ہے جو اپنے مریض کے ساتھ وہی سلوک کرتا ہے جو عشقہ (ایک زرد پھولوں والی بیل) اُس درخت کے ساتھ کرتی ہے جس پر وہ چڑھ جاتی ہے۔ عشقہ کا کام درخت کو خشک کر دینا ہے تو عشق کا کام عاشق کو ناتواں بنا دینا ہے ——— خیال رہے کہ لفظ عشق اسم عشقہ ہی سے ماخوذ ہے۔

عشق کے آگے کی منزل کا نام "تَتیم" ہے۔ تَتیم غلامی کو کہتے ہیں۔ اس منزل میں چاہنے والا اپنے خیالات و تصورات کا ایسا غلام بن جاتا ہے جس سے رہائی خود اس کے اختیار سے باہر ہو جاتی ہے، وہ ہر ایک دعویٰ سے دست بردار ہو جاتا ہے۔ اس کا جسم، اس کا دل، اس کی رُوح، اس کی آرزو، اس کی مُراد، بلکہ دُنیا کی ہر وہ چیز جو اُس کی سمجھی جاتی ہے، اُس کے نزدیک اس کی نہیں رہ جاتی۔ محبوب ہی کی خوشی، اُس کی خوشی اور محبوب ہی کی رضا، اُس کی رضا بن جاتی ہے۔

محبت کی اس منزل سے آگے بڑھنے پر "عبودیت" کا مقام ملتا ہے جہاں پہونچ کر عبد اُسی پر قانع، بلکہ شاکر نظر آتا ہے کہ اس کی عبدیت کا انتساب اس کے معبود کی طرف کرتے رہیں اور وہ اپنے معبود کا عبد کہلایا کرے۔

اس سے بھی بلند و بالا مقام "خلّت" کا ہے۔ جس میں جسم کے ایک ایک بال، رگوں میں دوڑنے والا ہر ہر قطرۂ خون، نبض کی ایک ایک حرکت اور سینہ کا ایک ایک سانس متفق المراد بن جاتے ہیں، جذبات اور آرزوؤں کا بالکلّیہ خاتمہ ہو جاتا ہے۔ دل و دماغ، طبع و رُوح میں پوری طاقت اور کامل وحدت کے ساتھ ایک ہی محبُوب کا خالِص رضوان مقصود و مطلوب بن جاتا ہے ——— خُلّت کے آگے حَبیبیّت کی منزل ہے۔ اس مقام پر خود مُحِب ہی اپنے محبُوب کا محبُوب و مطلوب ہو جاتا ہے ـــ مُحِب کی رضا خود اس کے محبوب کی رضا بن جاتی ہے۔ اب مُحِب سُنتا ہے تو محبُوب کے کان سے، دیکھتا ہے تو محبوب کی آنکھ سے، پکڑتا ہے تو محبوب کے ہاتھ سے، بولتا ہے تو محبوب کی زبان سے ——— المختصر اس کے فعل کو محبوب اپنا فعل

قرار دینے لگتا ہے۔

اس کے بعد جب محبت اور آگے قدم بڑھاتی ہے تو وحدت کا مقام ظہور میں آتا ہے۔ یہ مقام اس طرح ہاتھ آتا ہے: اوّلاً مُحب آئینہ کائنات میں تجلّیٔ اوّل کا جلوہ دیکھتا ہے، رفتہ رفتہ آئینہ نگاہوں سے غائب ہوجاتا ہے اور نظر اس تجلّی پر جم جاتی ہے، پھر اس تجلّی میں ایک وجود کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اس وجود کی کشش اس کو اپنا بنا لیتی ہے اور ہر غیر وجود پوشیدہ ہوجاتا ہے اور اس میں اس قدر انہماک ہوتا ہے کہ ہم۔ تم۔ یہ۔ وہ۔ سب اسی وجود میں فنا ہوجاتے ہیں اور قصد و ارادہ کے بغیر ہی زبان کہنے لگتی ہے:—
لَا موجودَ اِلّا ھو۔ بلفظِ دیگر لَا موجودَ اِلّا اللہ ——————

اُوپر کی اس مختصر تحریر سے محبت کے مدارج کو مذکورہ بالا صورتوں میں منحصر کر دینا مقصود نہیں، بلکہ یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ محبت کے مدارج تو بہت ہیں نیز ہر ہر درجہ کی محبت کے موجبات اور آثار بھی الگ الگ ہیں —— لیکن —— با ایں ہمہ سب کا تعلق دل کے میلان ہی سے ہے —— محبت کا باعث و موجب کچھ بھی ہو، حُسنِ صورت ہو یا حُسنِ سیرت، کوئی خوبی ہو یا اور کوئی تعلق، ہر شکل میں باعث و موجب کی موجودگی میں محبوب کی طرف دل کا میلان طبعی اور اضطراری ہی ہوگا نہ کہ عقلی اور اختیاری۔

یہ صحیح ہے کہ محبت کی بنیاد کسی کمالِ اصلی پر ہوتی ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بہت سے صفتِ جُود و سخا سے محبت کرنے والے کا جھکاؤ حاتم کی طرف —— اور —— سینکڑوں صفتِ عدل و داد کو محمود

سمجھنے والوں کا میلان نوشیروان عادل کی طرف ـــــ اور ـــــ ہزاروں صفتِ مردانگی و شجاعت کو پسند کرنے والوں کا رجحان رستم و اسفندیار کی طرف ـــــ اور ـــــ بے شمار علم و حکمت کے قدر دانوں کا جھکاؤ سقراط اور افلاطون کی طرف ہے۔ تو یہ سارا میلان، یہ سارا رُجحان اور یہ سارا جھکاؤ یقیناً فطری اور اضطراری ہے۔ اس میں انسانی اختیار کا کوئی دخل نہیں ہے۔

محبتِ عقلی کو سمجھانے کے لئے جو مثالیں دی جاتی ہیں، میرے خیال میں وہ مناسب نہیں، اس لئے کہ مریض کو صحت سے محبت ہوتی ہے نہ کہ دَوا سے۔ دوا تو وہ ضرورتاً استعمال کرتا ہے تاکہ وہ اپنے محبوب کو حاصل کر سکے۔ محبوب تک پہونچنے کی صعوبتیں، دشواریاں، تلخیاں اور پریشانیاں خواہ وہ دَوا اور نشتر کی صورت میں ہوں، یا صحرا نوردی اور دشت پیمائی کی شکل میں، یا کسی اور رُوپ میں، نہ وہ محبوب ہیں اور نہ بذاتِ خود مطلوب ہیں، بلکہ محبوب وہ ہے جہاں تک پہونچنے کے لئے ان صعوبتوں کو انگیز کیا جا رہا ہے ـــــ المختصر ـــــ جو محبوب ہے اس کی طرف دل کا میلان بالکل طبعی اور فطری ہے۔ اور جس کی طرف طبیعت کا جھکاؤ نہیں ہے اور صرف بہ تقاضۂ عقل اس کو اپنایا گیا ہے وہ محبوب نہیں ـــــ اسی طرح محبوب تو ہے فلاحِ دارین اور دین و دُنیا کی سلامتی، لیکن اگر اس محبُوب کو حاصل کرنے کے لئے باپ بیٹے، عزیزوں اور دوستوں کو قتل کر دینا پڑے، یا اپنے کو موت کے سپُرد کئے بغیر اس محبوب تک پہونچ نا ممکن ہو تو ان امور کو ضرورتاً اپنایا جائے گا۔ مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہ ہوگا کہ یہی قتل و

موت ہی محبوب ہیں، بلکہ محبوب تو وہی ہے، جس کی طرف دل کا جھکاؤ فطری وطبعی طور پر ہوا ہے۔ اور جس حد تک ان دشوار گذار مرحلوں کو طے کئے بغیر پہونچا نہیں جا سکتا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ محبت کے مدارج، محبوب کے مدارج پر منحصر ہوتے ہیں۔ محبوب جتنا زیادہ ارفع و اعلیٰ ہوگا، محبت کا درجہ بھی اسی قدر بلند و برتر ہوگا۔ محب کو محبوب کی ذات وصفات کا جتنا عرفان ہوگا اسی قدر زیادہ استحکام سے اسکی جانب میلانِ طبع ہوگا۔

نصوص میں جہاں جہاں کسی سے محبت کرنے کا حکم فرمایا گیا ہے ——— یا ——— محبت کرنے کی ترغیب دی گئی ہے ان تمام ارشادات کا منشاء صرف یہ ہے کہ جس کی محبت مطلوب ہے، اس میں موجباتِ محبت موجود ہیں لہذا تم اس کا عرفان حاصل کرو۔ جس قدر تم اس کے حسن واحسان اور خوبیوں کو سمجھ سکو گے، اسی قدر تمہارا دل طبعی اور فطری طور پر اس کی طرف مائل ہوگا اور تم اس سے محبت کرنے پر مجبور ہو جاؤ گے۔ محبت کا پاک چشمہ جو طبعِ انسانی میں صفتِ نورانی بن کر مستور و پوشیدہ ہے، اگر بالفرض خس وخاشاکِ علائق سے دب گیا ہوگا۔ یا سنگلاخ جہالت میں رک گیا ہوگا تو عرفان ومعرفت کے تیز دھارے اگر ایک طرف خس وخاشاک کو بہا لے جائیں گے تو دوسری طرف جہالت کی چٹانوں کو ریزہ ریزہ کر کے رکھ دیں گے۔ جس کے نتیجے میں چشمۂ محبت پھر فوارہ کی طرح اسی بلندی سے موجزن ہو جائے گا، جس بلندی سے چلا تھا ———

—— المختصر —— حدیث زیر شرح اور اس طرح کے ارشادات کا منشاء "تکلیف مالا یطاق" نہیں، بلکہ مقصودِ کلام فضیلتِ تفکر کو ظاہر کرنا اور غور و فکر کی دعوت دینا ہے —— فتح الباری ج ۱ ص ۴۵ میں ہے:

فی ھذا الحدیث ایماء الی فضیلۃ التفکر فان الاحبیۃ المذکورۃ تعرف بہ ؀

اس حدیث میں غور و فکر کی فضیلت کی طرف اشارہ ہے اس لئے کہ حدیث شریف میں مذکورہ احبیت کا عرفان غور و فکر ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔

وہ اس طرح کہ انسان کا محبوب یا تو اس کی اپنی ذات ہے یا اپنے سوا کوئی اور۔ پہلی صورت میں وہ آفتوں سے اپنی سلامتی اور اپنی دائمی بقا کا آرزومند ہوگا اور ظاہر ہے کہ یہ سلامتی اور بقا اس کا حقیقی مطلوب ہے۔ رہ گیا غیر سے محبت کرنا تو اگر واقعی ایسا ہے تو اس کی وجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ نفع کی مختلف صورتوں میں سے کسی نہ کسی طرح کا نفع اس کو حالاً یا مآلاً حاصل ہوا ہے۔ پس جب وہ اس نفع پر غور کرے گا جو اسے اس رسول کی طرف سے حاصل ہوا ہے، جس رسول نے اس کو کفر کی ظلمتوں سے نکال کر ایمان کا نور عطا فرمایا، خواہ بذاتِ خود نکالا ہو، یا کسی ذریعہ سے نکال دیا ہو، تو اُسے یقین ہو جائے گا کہ رسول کریم ہی ہیں جو

فردوس نعیم میں ہماری بقاء و دوام کا سبب ہیں۔ پھر وہ یہ بھی سوچنے پر مجبور ہوگا کہ آپ کا نفع بخشنا، تمام نفع بخش صورتوں سے عظیم تر ہے، تو یقیناً آپ کی طرف اس کے دل کا میلان غیروں کی طرف جھکاؤ سے زیادہ اور وافر نیز اغلب و اکثر ہوگا۔ کیونکہ وہ نفع جو محبت کا مرکز ہے وہ آپ کی ذات سے بخوبی اور بکثرت حاصل ہے۔ لیکن چونکہ لوگوں کی ذہنی صلاحیتیں مختلف ہیں، بعض اذہان میں رسول کریم علیہ السّلام کی خوبیوں کا عرفان اور آپ کی جانب سے ہونے والی منفعتوں کا استحضار ہے اور بعض ذہنوں میں یہ استحضار نہیں، اسلئے ہر انسان ایک ہی فیصلے پر متفق نہیں ہو سکتا اور آپ کی طرف ہر قلب کے میلان کی حالت ایک جیسی نہیں ہو سکتی ——

اس تحریر سے یہ بات بخوبی ظاہر ہو گئی کہ صحابۂ کرام کو رسول کریم سے جو بے پناہ محبّت تھی اس کا راز کیا تھا؟ —— بے شک یہ ان کی معرفت کا ثمرہ تھا جب وہ رسول کی معرفت میں کامل تھے تو پھر ان کی محبت کا بھی کامل ہونا ناگزیر تھا اور کیوں نہ ہو جب کہ اللہ کی توفیق و تائید ان کے شریکِ حال تھی —— الغرض —— خوبی اور کمال کی طرف انسانی طبیعت کا غیر شعوری جھکاؤ بالکل فطری ہے۔ اب اگر کسی انسان کا دل کسی خوبی یا کسی خوبی والے کی طرف مائل نہ ہو تو اس کی وجہ خارجی عوارض و علل ہیں جنہوں نے اس انسان کی فطرتِ اُولیٰ اور طبیعتِ مستقیم کو حجاب اندر حجاب کر دیا ہے۔ جب بھی یہ حجابات دُور ہو جائیں گے طبیعت اپنے فطری

میلان پر غیر شعوری طور پر مجبور ہو جائے گی۔

ذہن نشین رہنا چاہئے کہ کسی خارجی عوارض و علل کے سبب کسی فرد انسانی میں اس کا فطری جذبہ اگر مُردہ نظر آئے تو یہ اس بات کی دلیل نہیں کہ وہ انسان کا فطری جذبہ نہیں۔ جس طرح چند مخنّثوں اور راہبوں کا وجود اس بات کی دلیل نہیں کہ نفسانی خواہشات انسان کی فطرت نہیں ——— یا ——— جس طرح چند مختلف امراض کے مریضوں کو بھوک پیاس نہ لگنا، اس بات کی دلیل نہیں کہ یہ اُمور فطرتِ انسانی سے خارج ہیں۔ ان مقامات میں فطرت پر حجاب پڑ گیا ہے۔ اگر فطرت کو سمجھنا ہے تو ان عوارض کو ہٹا کر دیکھنا ہوگا ——— المختصر ——— خوبی اور کمال کی طرف انسانی طبیعت کا غیر شعوری میلان بالکل فطری ہے۔ اب اگر کسی فردِ انسانی میں اس میلان کا ظہور نہ ہو تو یہ ایک غیر فطری بات ہوگی جو کسی خارجی علّت کی پیداوار ہے۔

مذکورہ بالا تفصیلات سے واضح ہو گیا کہ محبّت طبعی اور صرف طبعی ہوتی ہے نہ کہ عقلی اور اختیاری ——— ہاں اگر کوئی بابِ محبّت میں یوں کلام کرے کہ بعض محبُوب وہ ہیں جن کی محبت فلاحِ دارین یا کسی قابلِ قدر فائدے کا سبب بن جاتی ہے، لہذا یہ محبت عقل کے نزدیک سُود مند ہے۔ اس کے برخلاف بعض محبوب وہ ہیں، جن کی محبت کسی فائدہ کا باعث نہیں ہوتی تو جو محبّت عقل کے نزدیک سُود مند ہو، اُس کو ہم حُبِّ عقلی کہیں گے اور اس کے سوا کو حُبِّ طبعی کہیں گے ——— اس صورت میں میری گزارش ہوگی کہ اگر حُبِّ عقلی اور حُبِّ طبعی کی مذکورہ تفریق بطور اصطلاحِ خاص

ہے تو اس کی پوری گنجائش ہے ـــــ لامناقشۃ فی الاصطلاح کا مشہور اصولی فقرہ ہمیں اجازت نہیں دیتا کہ اگر کوئی شخص کسی خاص لفظ سے کوئی خاص معنی بطور اصطلاح مُراد لے تو ہم اس پر کوئی اعتراض کریں ـــــ حُبِّ عقلی کہہ کر اصطلاحاً کچھ بھی مُراد لیا جا سکتا ہے ۔ لیکن اس نوع کی محبّت میں بھی طبیعت کی غیر شعوری دخل اندازی سے انکار نہیں کیا جا سکتا ۔ لہٰذا یہ اصطلاح سازی ان کے لئے کس طرح فائدہ بخش ہو سکے گی، جن کے نزدیک حُبِّ عقلی میں میلانِ طبع کا ذرّہ برابر شائبہ تک نہیں ۔ اس مقام پر علماء نے حُبِّ عقلی کی جو تعریفیں کیں ہیں اور اس کی مثالیں دی ہیں، جن سے صاف ظاہر ہے کہ حُبِّ عقلی میں طبعی میلان کا کوئی حصّہ نہیں ۔ ان سب کو اگر نظر انداز کر دیا جائے تو پھر اس کلام کی بھی گنجائش نکل سکتی ہے کہ بعض محبوب ایسے ہوتے ہیں، جن کی طرف طبعی میلان اُس وقت تک نہیں ہوتا جب تک کہ اُن کی ذات وصفات اور اُن کی خوبیوں کی سچّی معرفت نہ ہو جائے اور ظاہر ہے کہ معرفت کا ذریعہ عقل ہے ۔ جب عقل نے پہچانا تب جا کے دل مائل ہوا ۔ اگر عقل کو عرفان نصیب نہ ہوتا تو دل کا میلان کیسے ہوتا ؟ ـــــ دل کا میلان طبعی اور غیر شعوری سہی ۔ لیکن عقل کے پہچان لینے کے بعد ہی تو ہوا ۔ اس سے ظاہر ہو گیا کہ اس محبت کا وجود عقل کی کامل مداخلت کے بغیر ناممکن ہے ۔ لہٰذا اس طرح کی محبت کو حُبِّ عقلی کا نام دیدیا گیا اور چونکہ عقلی تگ و دَو انسان کے اپنے اختیار کی چیز ہے، لہٰذا اس محبت کو حُبِّ اختیاری کہنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ۔ رہ گئیں اس کے سوا وہ محبتیں، جن میں عقل و اختیار کی ذرا بھی مداخلت نہیں ہے ۔ ان کی تعبیر حبِ طبعی سے کر دی گئی ہے ۔

جیسے کسی انسان کا اپنی ذات، اپنے بیٹے، اپنے باپ، اپنے بھائیوں، اپنی بہنوں، اپنی بیوی، اپنے عزیزوں اور اپنے خاندان وغیرہ سے محبّت کرنا۔

یہ ساری محبتیں خالص طبعی ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی محبت عقل کی سفارش کا نتیجہ نہیں ——— تو کیا یہ ممکن نہیں کہ جن اکابرین ملّت اسلامیہ کی کتابوں کے حوالہ جات پیش کئے جا چکے ہیں، ممکن ہے انہوں نے حُبِّ طبعی اور حُبِّ عقلی سے یہی مذکورہ بالا معانی مُراد لئے ہوں ؟ اور یہ ظاہر ہے کہ کسی کی خاص اصطلاح میں بحث و مباحثہ کی گنجائش نہیں ہوتی۔

میں عرض کروں گا کہ یہ بخوبی ظاہر ہو چکا ہے کہ حُبِّ عقلی کے قائلین حُبِّ عقلی میں میلانِ طبع کی مداخلت تسلیم نہیں کرتے، بلکہ کراہتِ طبع کے ساتھ حُبِّ عقلی کا وجود مانتے ہیں، تو اب ان کی طرف اس دوسری اصطلاح سازی کو بھی منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے کہ حُبِّ عقلی کے مذکورہ بالا اصطلاحی معنی کی تشریح میں یہ اعتراف بخوبی نمایاں ہے کہ حُبِّ عقلی میں محبت کا آغاز وہیں سے ہوتا ہے جہاں سے محبوب کی طرف طبیعت کا غیر شعوری میلان شروع ہوتا ہے۔ اس غیر شعوری میلان سے پہلے محبت عالم وجود ہی میں نہیں آتی ———

میرے خیالِ ناقص میں اس کوشش کی قطعی ضرورت نہیں کہ محبت جو خالص وجدانی اور طبعی نیز غیر شعوری چیز ہے، اس کو خواہ مخواہ کے لئے اختیاری اور عقلی بنایا جائے۔ محبت کا محل دل ہے اور عقل کا دماغ ——— دونوں کے تقاضے جُداگانہ ہیں اور دونوں کا طرزِ عمل الگ الگ ہے۔ ایسی صورت میں عقل کو محبت کے خمیر میں داخل کر کے "حُبِّ عقلی" کی صُورت گری میری سمجھ سے باہر ہے۔ کیا آپ نے غور نہیں کیا کہ آج تک، جہاں تک

مجھے علم ہے، کسی نے بھی عقل کی ماہیّت میں محبت کو داخل کر کے "عقلِ حُبّی" کی ایجاد گوارا نہیں کی ہے، تو جب "محبت والی عقل" نہ بن سکی تو "عقل والی محبت" کیسے بن گئی ؟ —— المختصر —— عقل کا کام عرفان ہے، دل کا کام میلان ہے، - دونوں کے دو میدان ہیں ۔

میں آستانۂ دل پر عقل کی پاسبانی کا مخالف نہیں، لیکن پاسباں کو پاسباں ہی رہنے دیجئے، اس کو شہنشاہ نہ بنا دیجئے ۔ اگر دل کی شاہی کو مطلق العنان چھوڑ دینا عیب ہے تو اس کو نیک خواہشات کے لئے آزاد نہ چھوڑنا کون سا ہُنر ہے ؟

(الف) لازم ہے دل کے پاس رہے پاسبان عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

(ب) بے خطر کُود پڑا آتشِ نمرُود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

محبت بہر صورت طبعی اور وجدانی ہی چیز ہے خواہ وہ کسی داخلی یا خارجی تحریک کے بغیر آپ ہی آپ وجود میں آئی ہو۔ جیسے اپنی ذات سے محبت —— یا —— عقلی سفارش اس کے وجود کا سبب بنی ہو جیسے احسان کرنے والوں کی محبت —— یا —— کسی دوسرے اسباب کا توسط و ذریعہ اس کو منصّۂ شہود پر لایا ہو۔ جیسے حسین و جمیل صورت اور اچھی خوبیوں سے محبت ——

علامہ قسطلانی کی مواہب لدنیہ میں ایک ایسا صاف اور واضح جملہ موجود

ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اپنی ذات کے سوا انسان جس جس سے بھی محبت کرتا ہے اس میں اسباب کی مداخلت ضرور ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں:

حب الانسان نفسه طبع وحب غيره

اختيار بتوسط الاسباب ٥

انسان کا اپنے سے محبت کرنا طبعی ہے اور اپنے غیر سے محبت

کرنا اختیاری ہے جو اسباب کے توسط سے ہے۔

خطابی کے حوالے سے یہی بات علامہ قسطلانی نے فتح الباری کتاب الایمان والنذور میں کہی ہے۔

یہ پورا جملہ اپنے اندر کوئی ابہام نہیں رکھتا ——— با ایں ہمہ ——— جب ہم اس کو اسکے سیاق وسباق کی روشنی میں دیکھتے ہیں تو روزِ روشن کی طرح یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ اس جملہ سے یہی بتانا مقصود ہے کہ انسان کا صرف اپنی ذات سے محبت کرنا ہی طبعی ہے۔ اپنے سوا کسی سے بھی وہ محبت کرے تو وہ اختیاری محبت ہوگی جس کا وجود اسباب و وسائل کا مرہونِ منت ہے ——— لیجئے ——— اب تو باپ بیٹے کی آپس کی محبت بھی طبعی نہ رہ گئی ——— اب آئیے اور گہرائی میں اتر کر اور ادھر اُدھر کے مفروضات و مشہورات سے صرفِ نظر کرکے اس مسئلہ کی چھان بین کی جائے ——— فرض کیجئے ——— کسی شہر میں سیلاب آیا، بہت سے گھر بہے، بہت سے گھر والے لاپتہ ہوئے اور ایک گھر پر تو یہ مصیبت آئی کہ وہ سیلاب کی زبردست زد میں آگیا، گھر بھی بہہ گیا، گھر والے بھی بہہ گئے، گھر والوں میں میاں، بیوی کے سوا ان کا دو سالہ اکلوتا

بیٹا بھی تھا ——— میاں، بیوی تو کچھ آگے جا کر تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر کنارے لگ گئے۔ ساحل پر کھڑے ہونے والوں کی مدد سے وہ باہر آگئے، کچھ دیر کے بعد ہوش آیا، کچھ جانی پہچانی صورتیں نظر آئیں ——— المختصر ——— میاں بیوی، کو ایک دوسرے سے ملنا بھی نصیب ہوگیا ——— مگر ——— ان کا وہ اکلوتا بیٹا نہ جانے بہہ کر کہاں پہونچ گیا کہ ان کی بے پناہ کوششوں سے بھی ان کو نہ مل سکا۔ لیل و نہار کی گردش ہوتی رہی، دن مہینے میں، مہینے سال میں بدلتے رہے، سیلاب کب کا رفع دفع ہوگیا، اُجڑے دیار بس گئے، بے گھر پھر سے گھر والے ہوگئے۔ مذکورہ میاں بیوی بھی اپنے ہی شہر میں اپنے ہی گھر کو بنا کر زندگی بسر کرنے لگے ———

بیٹے کا یہ حال رہا کہ وہ سیلاب میں ایک تختے کے سہارے دُور اور بہت دُور نکل گیا۔ کافی دُور نکل جانے کے بعد کسی نے اُسے بہتا ہوا دیکھا، کشتی کے ذریعہ نکالا اور بچّے کو زندہ پاکر مسرور ہوا اپنی بیوی کے پاس لے گیا وہ بھی بہت خوش ہوئی کیونکہ لاولد تھے گویا صاحب اولاد ہوگئے۔

فرض کیجئے کہ یوں ہی پندرہ سال گزر گئے، پندرہ سال کے بعد بغرضِ تجارت یہی بچّہ اسی شہر میں آتا ہے جہاں اس کے حقیقی والدین اور دوسرے اعزّہ رہتے ہیں، بیٹے کا اپنے باپ سے آمنا سامنا بھی ہوتا ہے، مگر یقین جانئے کہ نہ بیٹے کا کوئی میلان باپ کی طرف ہوتا ہے اور نہ باپ کا بیٹے کی طرف۔ اور اگر اسی بیٹے کو کوئی اس کے گھر میں کر دے (جس کو ابھی تک وہ خود اپنا گھر نہیں سمجھتا) تو باور کیجئے اس کی پردہ نشیں ماں اس کو دیکھ کر ایسا ہی بھاگے گی جیسے کوئی خاتون نامحرم کو دیکھ کر چھپنے کی

کوشش کرتی ہے۔

اس مثال نے ظاہر کردیا کہ باپ اور بیٹے کا ایک دوسرے کی طرف قلبی جھکاؤ بھی کسی نہ کسی قدر علم و معرفت اور خارجی اسباب نیز بیرونی محرکات کا محتاج ہے ـــــــ یہ بات صحیح ہے کہ اس علم و معرفت اور ان خارجی اسباب و محرکات کا احساس گھر کی محدود چہار دیواری اور اپنے اس مخصوص ماحول و سوسائٹی میں نہیں ہو پاتا جہاں کا طرز رہائش معروف و متعارف شکل اختیار کئے ہوئے ہے ـــــــ لیکن ـــــــ عدمِ احساس عدمِ وجود کو مستلزم نہیں۔ غور و فکر کے اس زاویے سے پتہ چلتا ہے کہ علامہ قسطلانی کا ارشاد بالکل واقعیت پر مبنی ہے کہ انسان صرف اپنی ذات سے محبت کرنے میں عقلی سفارش اور خارجی اسباب کا دست نگر نہیں ـــــــ

میرے نزدیک چونکہ محبت طبعی ہی ہوتی ہے خواہ آپ سے آپ ہو، خواہ اسباب کے توسط یا عقل کی سفارش سے ہو، لہذا مجھے ضرورت نہیں کہ میں یہ تشریح کروں کہ علامہ موصوف نے جس محبت کو اختیاری فرمایا ہے اس کو میں نے طبعی کیسے قرار دیا ہے۔ میں نے تو اپنے معروضات کو علامہ موصوف کی عبارت کو زیر بحث لانے سے پہلے ہی مفصل طور پر پیش کردیا ہے ـــــــ لیکن ـــــــ جن علمائے کرام نے حُبِّ طبعی اور حُبِّ عقلی بلفظِ دیگر حُبِّ طبعی اور حُبِّ اختیاری کی تقسیم کو قبول فرمالیا ہے اور پھر وہ باپ بیٹے کی محبت کو حُبِّ اختیاری کے خانہ سے نکال کر حُبِّ طبعی کے خانہ میں رکھتے ہیں، ان سب کے لئے علامہ قسطلانی کا ارشاد لمحۂ فکریہ ضرور ہے۔

میرے معروضات پر غور کرنے والے حضرات اس بات کو ذہن نشیں

رکھیں کہ میرے نزدیک عقل کو کسی شے کے خوب یا ناخوب، حق یا باطل، صدق یا کذب، صواب یا خطا، طیب یا خبیث، حسین یا قبیح اور پسندیدہ یا ناپسندیدہ ہونے کا فیصلہ کرنے کا پورا حق ہے اور ان میں سے ہر ایک کو اسکے مدّمقابل سے ممتاز کر دینے کا اُسے پورا اختیار ہے ــــــ مگر ــــــ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ عقل کے خوب و پسندیدہ کو عقل کا یا عقل والے کا محبوب قرار دے کر "حُبِّ عقلی" کی داغ بیل ڈالی جائے۔ اس لئے کہ عقل کے خوب کو اس کا یا عاقل کا محبوب قرار دینا، عرف و عادت کے خلاف ہے۔ نیز عقل کا کسی شئے کی خوبی یا کسی شئے پر اپنی پسندیدگی وغیرہ ظاہر کرنا صرف اس لئے ہے تاکہ دل اس کی طرف مائل ہو جائے اور اسے اپنا لے ــــــ عقل کا کام رہنمائی ہے۔ دل کا کام میلان اور پھر تصدیق ہے ــــــ عقل کا کام خوب و پسندیدہ چیزوں کو ظاہر کر دینا ہے، دل کا کام ان کو اپنا محبوب بنا لینا ہے۔ عقل کا کام جاننا ہے اور دل کا کام ماننا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ صرف کسی شے کو جان لینے سے وہ شے محبوب نہیں بنتی اور کسی شے کو دل مان نہیں سکتا جب تک کہ اوّلاً اس کی طرف اس کا میلان نہ ہو جائے۔ میلان ہی کا نام محبت ہے اور محبت ہی تصدیق پر آمادہ کرتی ہے۔

تاریخ اسلام میں اس طرح کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں کہ بہت سے کافر اس اقرار پر مجبور ہو گئے کہ محمّد عربی صلی اللہ علیہ وسلم سچے نبی ہیں، آپ کا دعویٔ نبوّت سچّائی پر مبنی ہے، آپ امین ہیں، صادق الاقوال ہیں ــــــ دیکھا آپ نے عقل سب کچھ جان گئی ــــــ خوب کیا ہے؟ ناخوب کیا ہے؟ پسندیدہ کیا ہے؟ ناپسندیدہ کیا ہے؟ حق کیا ہے؟ باطل کیا ہے؟

لیکن دل، عقل کی اندرونی تحریک سے متأثر نہ ہوسکا اور اپنی ضد پر اَڑا رہا ۔ جس کا کام جاننا تھا اُس نے تو جان لیا اور خوب جان لیا، مگر اس جان لینے سے زندگی کو کیا فائدہ پہونچا جب کہ جس کا کام ماننا تھا وہ مان نہ سکا —— اب اگر اسی جان لینے اور پہچان لینے سے آپ نے عقل کے خوب و پسندیدہ کو عقل کا یا عاقل کا محبوب قرار دے دینا پسند کر لیا اور آپ کو حُبِّ عقلی کی ترکیب راس آ گئی ۔ پھر تو اگر ایک طرف یہ اقرار کرنا پڑے گا کہ نبی کریم بہت سے کافروں کے عقلی محبوب تھے اور کُفّار کو بھی آپ سے حُبِّ عقلی تھا (گو آپ کو ان کے دلوں نے تسلیم نہیں کیا تھا) تو دوسری طرف یہ سوچنا پڑے گا کہ کیا نصوص، نبی کریم کے لئے آپ سے اسی طرح کا حُبِّ عقلی چاہتی ہیں جس سے کافر بھی محروم نہ تھے ۔ ؟

(۵) محبت کی تعریف و تفہیم اِن لفظوں میں بھی کی گئی ہے ۔

مواہب لدنیہ میں ہے :

اعلم ان المحبة کما قال صاحب المدارج
هی المنزلة التی[۱] یتنافس فیها المتنافسون
والیها[۲] یشخص العاملون والی علمها[۳] شمر
السابقون وعلیها[۴] تفانی المحبون وبروح[۵]
نسیمها تروّح العابدون فهی[۶] قوة القلوب
وغذاء الارواح وقوة العیون وهی[۷] الحیاة التی
من حرمها فهو من جملة الاموات والنور[۸]
الذی من فقده ففی بحار الظلمات والشفاء

الذی من عدمه حلت بقلبه جمیع الاسقام واللذة[10] التی من لم یظفر بها فعیشه کله هموم وآلام وهی[11] روح الایمان والاعمال والمقامات والاحوال التی متی خلت منها فهی کالجسد الذی لا روح فیه تحمل[12] اثقال السائرین الی بلد لم یکونوا الا بشق الانفس بالغیه وتوصلهم[13] الیٰ منازل لم یکونوا بدونها ابدا واصلیها وتبوؤهم من مقاعد الصدق الی مقامات لم یکونوا لولا هی داخلیها وهی مطایا القوم التی سراهم فی ظهورها دائما الی الحبیب و طریقهم الاقوم الذی یبلغهم الیٰ منازلهم الاولیٰ من قریب تاللہ لقد ذهب اهلها بشرف الدنیا والآخرة اذلهم من معیة محبوبهم أوفر نصیب وقد قدر اللہ یوم قدر مقادیر الخلق بمشیئته وحکمته البالغة (ان المرء مع من احبه)

" بقول صاحب مدارج السالکین محبت وہ بلند و برتر مرتبہ ہے جس[1] میں بطور مبالغہ رغبت کرنے والے باہم مقابلہ کریں (اور اس منزل کو حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے پر سبقت

کریں اور ہر ایک یہی کوشش کرے کہ وہ محبت کی اس منزل تک پہونچ جائے جہاں اس کا غیر نہ پہونچ سکے ۔)

اور جس[۲] کی طرف عمل کرنے والے ٹکٹکی لگا دیں (اور اس بلند و بالا مرتبہ کو پانے کے لئے پُر خلوص عمل کی جد و جہد کرتے رہیں)

اور جس[۳] کی معرفت حاصل کرنے کی طرف سبقت کرنے والے چُستی کریں (اور اُس تک پہونچنے میں تیز روی اختیار کریں ۔)

اور جس[۴] پر چاہنے والے اپنے کو فنا کر دینے میں مبالغہ کریں (اور کوشش کریں کہ ان کی محبت ان کے غیر کی محبت پر سبقت لے جائے ۔)

اور جس[۵] کی نرم ہوا کی خوشبو سے عبادت کرنے والے معطر ہو جائیں (اور عابدین کو جب ان کی اچھی مہک ملے تو ان کے نفوس کو سکون و اطمینان حاصل ہو جائے اور وہ اس سے لذت و راحت کا احساس کریں)[۶] پس محبّت دلوں کی توانائی ہے اور رُوحوں کی غذا ہے اور آنکھوں کی ٹھنڈک ہے (یعنی محبت سے آنکھوں کو سُرور و سکون میسّر آتا ہے ۔)

اور محبت[۷] ایک ایسی زندگی ہے جو اس سے محروم رہے اس کا شمار مُردوں میں ہے (اس لئے کہ جس طرح مُردے اس کی لذت سے نا آشنا ہیں اسی طرح یہ بھی ہے ۔)

وہ ایک[۸] ایسا نُور ہے کہ جس نے اُسے کھو دیا تو وہ تاریکیوں کے سمندر میں ہے ۔ (اور ایسا ڈوبا ہوا ہے کہ کسی نفع بخش

صورت کی طرف جانے کی اسے راہ نہیں مل سکتی ۔)
اور [9] وہ ایسی شفا ہے کہ جس نے اسے گم کر دیا تو اس کے قلب پر طرح طرح کے طویل امراض کا حلول و نزول ہوا اور وہ ایک [10] ایسی لذت ہے جس کے حصول میں ناکام رہنے والے کی زندگی تمام کی تمام غم و آلام کا مجموعہ ہے ۔ اور وہ ایمان [11] و اعمال اور مقامات و احوال کی وہ رُوح ہے جو نہ ہو تو یہ سارے کے سارے بے رُوح جسم کی طرح ہو جائیں ۔
محبت [12] ہی ہے جو ان راہرؤوں کے بوجھ کو ہلکا کر دیتی ہے جو ایسے شہر کی طرف جانے والے ہیں جہاں نفس کو بے پناہ مشقت میں ڈالے بغیر نہیں پہونچا جا سکتا ۔
محبت [13] ہی ہے جو ان کو ان منزلوں تک بآسانی پہونچا دیتی ہے جہاں اسکے بغیر کبھی نہیں پہونچا جا سکتا تھا ۔ محبت ہی ہے جو ان مجالسِ حق (ایسی مجلس جو لغویات اور گناہوں سے خالی ہو) سے لے کر جنت کے ان مقاماتِ بلند تک ٹھکانہ بناتی ہے، جن میں اس کے بغیر داخلہ نہیں ہو سکتا تھا ۔ اور محبت قوم کی وہ سواری ہے جس کی پشت پر اس کا سفر ہمیشہ حبیب ہی کی طرف ہوتا ہے ۔ اور محبت ہی قوم کی وہ راہ مستقیم ہے جو اسے اس کی پہلی منزلوں تک بآسانی جلد پہونچا دیتی ہے ۔ (وہ پہلی منزلیں جہاں وہ اُس وقت تھی جبکہ پشتِ سیدنا آدم میں تھی یعنی جنت) ۔ قسم خدا کی اہلِ محبت دنیا و آخرت

دونوں کا شرف لے گئے اس لئے کہ ان کے لئے ان کے محبوب
کی معیّت سے کامل و مکمل حصّہ ہے (اس لئے کہ محبت دونوں
جہان کو شامل ہے، خواہ مُحِب اپنے محبُوب کو دنیا میں نہ پائے
یا مُحِب و محبُوب کے مابین مسافت کی دُوری ہو اور یقیناً
اللہ نے اُسی دن جس دن تمام مخلوق کی تقدیروں کی تعیین
فرمائی تھی (یعنی زمین و آسمان کی تخلیق سے پہلے ہی) اپنی
مشیّت و حکمتِ تامّہ سے یہ طے فرما دیا تھا کہ بے شک آدمی
اُسی کے ساتھ ہوگا جس سے محبت کی۔ (جیساکہ نبی کریم
صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس قول مُبارک سے اشارہ فرمایا
ہے " انت مع من احببت " تو اُسی کے ساتھ ہوگا جس سے
تو نے محبت کی)۔"

محبت کے اسباب و موجبات، علامات و شواہد، آثار و ثمرات
اور فوائد و احکام کی توضیح و تشریح مختلف عبارتوں میں بکثرت کی گئی ہے
اس سلسلے میں بہتوں نے اپنی سمجھ بوجھ اور مقتضائے حال کے مطابق گوہر
افشانی کی ہے، بعض عارفین ارشاد فرماتے ہیں :

" محبت یہ ہے کہ مُحِب اپنے اَوصاف کو محو کردے اور
محبوب کی ذات و صفات میں ایسا فنا ہو جائے کہ اپنے اِس
فنا ہونے کا بھی ادراک نہ کرسکے، یعنی اپنی صفتِ فنا کو
بھی فنا کردے اور فناء الفناء کی منزل پر گامزن ہو جائے

یہاں تک کہ اپنے محبوب کے سوا ہر ایک کو معدوم قرار دے۔"

مذکورہ بالا عبارت سے محبت کے جس مقام کا اظہار ہو رہا ہے اس کو صرف وجدان سے سمجھا جا سکتا ہے، الفاظ و عبارات اس کو سمجھانے کے لئے قاصر ہیں۔ وجدان سے بھی وہی سمجھ سکتا ہے جو اس منزلِ فنا تک پہونچ چکا ہو۔

وحید العصر سلطان العارفین علامہ حضرت ابو یزید طیفور ابن عیسیٰ بسطامی قدس سرہٗ متوفی ۲۶۱ھ کا ارشاد ہے:

"محبت[2] یہ ہے کہ مُحِب اپنے زیادہ کو کم سمجھے اور اپنے محبوب کے کم کو بہت سمجھے اور بہت شمار کرے۔"

اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جو مُحِبّ صادق ہوگا وہ اپنے محبوب پر اپنا سب کچھ قربان کر دینے کے بعد یہی خیال کرے گا کہ اس نے کچھ نہیں کیا — اس کے برخلاف اگر اس کا محبوب اس کو ایک ادنیٰ چیز دیدے تو وہ اس کو بہت عظیم اور بہت زیادہ شمار کرے گا، گویا اس کو عظیم نعمت مل گئی۔

بعض علماء فرماتے ہیں:

"محبت[3] یہ ہے کہ مُحِب بارگاہِ محبوب میں اپنی تھوڑی سی نافرمانی کو بہت سمجھے اور زیادہ سے زیادہ اطاعت کو کم تصوّر کرے۔"

محبت کی یہ تیسری تعریف اور اُوپر ذکر کی ہوئی دوسری تعریف میں صرف اتنا فرق ہے کہ تعریف میں محبوب کی طرف سے کچھ ہونے کا ذکر ہے۔ لیکن اس تیسری تعریف میں جنایت و طاعت دونوں مُحِب ہی کی طرف سے ہیں۔

صاحبِ کراماتِ کثیرہ، و تصانیفِ جلیلہ، حبرِ ملّت، فریدالدہر

عارف باللہ حضرت سہل بن عبداللہ قدس سرہٗ متوفی ۲۸۳ھ یوں گوہر افشاں ہیں :

"محبت[۴] یہ ہے کہ مُحب اپنے محبوب کی اطاعت کو اپنے اُوپر لازم کرلے اور وہ بھی کرے محبوب جس کا حکم دے اور وہ بھی کرے جو محبوب چاہے اگرچہ حکم نہ دے ـــــــ نیز محبوب جو جو چاہے کسی میں بھی اس کی مخالفت نہ کرے اور ایسی بات ہرگز نہ کرے جس سے محبوب نے روک دیا ہو اور منع کر دیا ہو۔"

شیخ موصوف نے اسی مذکورہ بالا مفہوم کی "معانقۃ الطاعۃ ومباینۃ المخالفۃ" کے لفظوں سے تعبیر کی ہے ـــــــ بعض علماء فرماتے ہیں :

"محبت[۵] یہ ہے کہ مُحب محبوب کی موافقت اس کی موجودگی اور غیر موجودگی دونوں صورتوں میں کرے۔"

یقیناً یہی محبت کا تقاضہ ہے کہ محبوب سامنے ہو یا نہ ہو' دونوں صورتوں میں اس کی کامل موافقت کی جائے ـــــــ شیخ المشائخ سیدنا ابوعبداللہ محمد بن احمد بن ابراہیم قرشی قدس سرہٗ متوفی ۵۹۹ھ[۱۷] کا ارشاد ہے :

"محبت[۶] یہ ہے کہ مُحب اپنے محبوب کو اپنی ہر ہر چیز کا مالک بنادے اور اپنے لئے اپنی طرف سے کچھ باقی نہ رکھے۔"

یعنی مُحب اپنے محبوب کو اپنے ارادوں' اپنے عزائم' اپنے افعال' اپنی ذات' اپنے اموال اور اپنی موجودہ حالت کا پورا مالک بنادے اور ان تمام کو

اس کی مرضی کے لئے وقف کر دے اور اسی کی مرضی اور اسی کی پسندیدہ چیزوں سے راضی رہے، اُس کے سوا کسی اور کی مرضی پر نظر نہ کرے اور مذکورہ بالا وقف کی ہوئی چیزوں سے اپنی ذات کے لئے اُسی قدر لے جس قدر اس کا محبوب اس کو عطا کرے۔ اور چونکہ اُس نے اپنا سب کچھ محبوب پر وقف کر دیا ہے اور اس کے پاس کچھ باقی نہیں رہ گیا ہے تو اب ان وقف کردہ چیزوں سے اس کا محبوب جو اُسے عطا کرے وہ اس کے محبوب کی طرف سے ہے، نہ کہ اس کی طرف سے ——— بعض علماء فرماتے ہیں:

"محبت یہ ہے کہ محب ماسوی المحبوب کو اپنے دل سے بالکلیہ مٹادے"۔

یہاں تک کہ اپنی ذات کو بھی فراموش کر دے اور ظاہر ہے کہ کمالِ محبت تقاضہ یہی ہے، کیونکہ اگر دل میں محبوب کے سوا کی بھی گنجائش رہی اور دل غیر محبوب کا بھی مسکن رہا تو یقیناً محبوب کی محبت خالص نہیں ہو سکتی اور اس میں کسی نہ کسی طرح کی ملاوٹ ضرور رہے گی جو شانِ محبت کے خلاف ہے ——— قطب العارفین حضرت ابوبکر شبلی متوفی ۳۳۴ھ قدس سرہٗ کا ارشاد ہے:

"محبت یہ ہے کہ محب اپنی ذات کو حقیر سمجھے اور بہت چھوٹا تصور کرے اس بات سے کہ اس جیسا ذلیل و حقیر ایسے جلیل الشان محبوب سے محبت کرے پس اس کو اس پر شرم آئے اور وہ غیرت کھائے کہ اس نے رشتۂ محبت قائم کر کے اپنے محبوب کی طرف ایک حقیر شے کو منسوب کیا ہے"۔

علامہ موصوف "تغار علی المحبوب ان یحبہ مثلک" سے اسی مذکورہ بالا مفہوم کی توضیح فرما رہے ہیں ——— بعض علماء فرماتے ہیں :

"محبت یہ ہے کہ مُحِب ماسوی المحبوب اور محبوب دونوں کی طرف سے اپنے گوشۂ قلب کو جُھکا لے، نیچا کرلے، پھیر لے، غیر محبوب سے تو اس لئے پھیر لے کہ محبوب کے سوا کسی اور کی طرف میلانِ قلب باعثِ شرم و غیرت ہے۔ رہ گیا محبوب تو کمال محبت کے باوجود اس کی طرف سے قلب کا پھیر لینا ناممکن جیسا ہے اس لئے کہ "میلانِ قلب" ہی تو محبت کا اصل معنی ہے تو پھر محبوب سے پھر جانے کا سوال ہی کیا ؟ ———

با ایں ہمہ ——— جب سُلطانِ محبت کا پورا تسلّط ہو جاتا ہے غیر اختیاری طور پر ایسا ہی واقع ہوتا ہے اور اپنی اس کیفیت کا ادراک خود مُحِب کے بس کی چیز نہیں — محبوب کی طرف سے پھیرنے میں کچھ اس کی عظمت و ہیبت کا دخل ہوتا ہے اور کچھ اس سے شرم و غیرت کا۔"

اس کیفیت کو بھی محبت کی ان علامات میں شمار کیا گیا ہے، جن میں محبوب کی ہیبت و تعظیم کے عناصر بخوبی اور بکثرت شامل ہیں۔ محبت کی یہ صورت جس میں میلان بھی ہو، تعریف بھی ہو لفظوں اور عبارتوں سے نہیں سمجھائی جاسکتی

———

سید الطائفہ سلطان الاولیاء حضرت ابوالقاسم جنید بن محمد بغدادی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت حرث بن اسد بصری محاسبی متوفی ۲۴۳ھ قدس سرہٗ کو ارشاد فرماتے ہوئے سُنا ہے کہ آپ معنیٔ محبت کی

تشریح فرماتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں :

" محبت[10] یہ ہے کہ مُحِب محبوب کی طرف اپنی پوری کائنات کے ساتھ بالکلیہ مائل ہو جائے اور پھر ہر حال میں اپنی ذات، اپنی جان اور اپنے مال پر اپنے محبوب کو ترجیح دے اور پھر علانیہ اور خفیہ ہر طرح سے محبوب کی موافقت کرے اور یہ سب کچھ کرنے کے بعد بھی یہی جانے کہ محبوب کی محبت میں اس سے کمی ہی واقع ہو رہی ہے یعنی کما حقہٗ وہ محبت نہیں کر سکا ہے۔"

حضرت قریشی قدس سرہٗ نے محبت کی جو تعریف کی ہے اور جس کو میں نقل بھی کر چکا ہوں، یہ تعریف اور وہ تعریف ایک ہی ہے صرف عبارتوں کا فرق ہے ——— اسی مقام پر یہ ذہن نشین کر لیجیے کہ فائدہ ۵ کے تحت اب تک محبت کی تعریف میں جو جو عبارتیں پیش کی گئی ہیں اور آگے بھی اسی فائدہ کے ضمن جن جن لفظوں میں محبت کی تفہیم کرائی جائے گی ان تمام تعریفوں کا اختلاف صرف لفظی ہے اور صرف ان کی عبارتیں ہی مختلف ہیں جو محبت کرنے والا محبت کی جس منزل پر رہا اس نے محبت کی تشریح میں اسی کا اظہار کر دیا ——— از روئے حقیقت اور معنوی طور پر دیکھئے تو ان تمام تعریفوں کا ماحصل و نتیجہ ایک ہی ہے ———

بعض علماء فرماتے ہیں :

" محبت[11] وہ سُکر (نشہ) ہے جو محبوب کے مشاہدہ کے سوا کسی اور چیز سے نہ اُترے۔"

صوفیاء کے نزدیک "غیبتہ بوارد قوی" کسی مضبوط اور قوی کے متوجہ ہو جانے سے کسی کا کھو جانا سُکر ہے۔ غیبت عدم احساس کا نام ہے، جب چہرۂ جمال سے پردہ اُٹھتا ہے تو دیکھنے والے کا دل بے اختیارانہ طور پہ اس کی طرف مائل ہو جاتا ہے، خوشی سے جھُومنے لگتا ہے اور اس پر ایک طرح کی مستی اور مدہوشی طاری ہو جاتی ہے، جس سے اس کی قوت احساس مفقود ہو جاتی ہے اور پھر یہ نشہ اسی وقت اُترتا ہے جبکہ چہرۂ محبوب سامنے آجائے۔

"محبوب کے دیدار کے وقت بھی مُحِب پر ایک مستی سی طاری ہوتی ہے جو تعریف و توصیف سے بالاتر ہے۔"

سچّے محبت کرنے والوں پر نشہ طاری ہونا کچھ جام و ساغر پر موقوف نہیں، بلکہ صرف محبوب کے دیدار سے انہیں ایسی مستی حاصل ہوتی ہے جو تعریف سے بالاتر ہے ———

بعض علماء فرماتے ہیں:

"محبت[۱۲] یہ ہے کہ مُحِب کا دل طلبِ محبوب میں ہمیشہ متوجہ رہے اور مُحِب کی زبان ذکرِ محبوب پر اس قدر رواری تیاری اور شیفتہ ہو کہ کبھی بھی محبوب کا ذکر کرنے میں سُست نہ پڑے اور کوتاہی نہ برتے۔"

محبوب کی طلب میں قلب کی توجہ سے مُراد یہ ہے کہ قلب میں ہمیشہ محبوب کی لقاء کا شوق موجزن رہے، اس لئے کہ ہر مُحِب اپنے حبیب کی لقاء کا آرزو مند ہوتا ہے۔ رہ گئی محبوب کے ذِکر پر زبان کی فریفتگی اور شیفتگی ——— تو یہ بھی ظاہر ہے۔ اس لئے کہ ہر چاہنے والا اپنے محبوب کا بکثرت ذکر کرتا

ہے۔ نبی کریم علیہ التحیۃ والتسلیم کا ارشاد ہے :

من احب شیئاً اکثر من ذکرہ

(زرقانی بحوالہ ابونعیم و دیلمی)

(اس ارشاد کا حاصل یہ ہے) ہر محبت کرنے والا اپنے محبوب کا بکثرت ذکر کرتا ہے۔

—— بعض علماء فرماتے ہیں :

"محبت یہ ہے کہ انسان ان اُمور کی طرف مائل ہو جائے جو اُس کے موافق ہوں" ——

—— مثلاً حسین صورتیں، اچھی آواز، لذیذ کھانے، خوش ذائقہ مشروبات، رُوح پرور خوشبو، دلکش ملبوسات اور ان کے علاوہ وہ امور جن کی طرف طبع سلیم کا میلان ناگزیر ہو۔

—— "طبع سلیم" کی قید سے یہ اشارہ مقصود ہے کہ وہ طبیعتیں جو خارجی عوارض و علل کے سبب سخت ترین ہو گئی ہیں اور جن کی قوتِ احساس فاسد ہو گئی ہے اور جو میٹھا س میں بھی کڑواہٹ محسوس کرتی ہیں —— نیز —— جن کا ذوق اتنا فاسد ہو گیا ہے کہ خوش ذائقہ چیزوں سے بھی ان کے منہ کا مزہ بگڑ جاتا ہے۔ اس طرح کی ساری طبیعتیں خارج از بحث ہیں ——

—— یہ ظاہر ہے کہ وہ خوبیاں جو طبیعت کے لائق و موافق ہوں اور جن کی طرف طبعِ سلیم بے اختیارانہ طور پر مائل ہو جائے ۲ دو ہی ہیں :

۱۔ حُسن ۲۔ احسان

"حُسن بین" حُسنِ صُورت بھی ہے جس کا ادراک قوتِ باصرہ کے ذریعہ ہوتا ہے اور حُسنِ صوت بھی ہے جس کا ادراک قوتِ سامعہ کے ذریعہ ہوتا ہے۔ نیز ان کے علاوہ وہ ساری خوبیاں "دائرۂ حُسن" میں داخل ہیں جن کا ادراک ظاہری اور باطنی حواس کے ذریعہ ہوتا ہے اور جن سے طبیعت کو لذّت و فرحت کی دولت میسّر آتی ہے ——— یہ بھی خیال رہے کہ ان معانیٔ لطیفہ اور اوصافِ شریفہ کا شمار بھی حُسن ہی میں ہے جن کا ادراک بقول اہلِ شرع قویٰ باطنہ اور بقول حکماء عقل کے ذریعہ ہوتا ہے، جس کے نتیجے میں انسانوں کے قلوب' صالحین' علماء نکوکاروں اور اچھی خصلت والوں کی طرف بے اختیارانہ طور پر مائل ہو جاتے ہیں ——— رہ گیا احسان و انعام اور جُود و سخاوت کی وجہ سے انعام پانے والوں کا اپنے منعم کی طرف قلبی جُھکاؤ تو یہ بھی ایک فطری ادا ہے' اس حقیقت سے کسے انکار ہو سکتا ہے کہ:

قد جبلت القلوب علی حب من احسن الیھا
و بغض من اساء الیھا ٥

مُحسِن کی محبّت اور دشمن کی عداوت کے عناصر انسانی قلوب کی تخلیق کے وقت ہی اُن میں رکھ دیئے گئے ہیں۔

(مواہب بحوالۂ ابونعیم فی الحلیہ و ابوشیخ وغیرہما)

زرقانی نے "جبلّت" کی تشریح "خلقت و طبیعت" سے فرما کر واضح کر دیا کہ مُحسِن کی طرف انسانی قلوب کا جُھکاؤ پیدائشی اور طبعی ہے۔ جس کے عناصر اللہ تعالےٰ نے شروع ہی سے اس کی فطرت میں

ودلیعت فرمادیئے ہیں۔

اِس مقام پر اس بحث کی قطعی ضرورت نہیں کہ " قد جبلت القلوب الخ " سے متعلق یہ تحقیق کی جائے کہ یہ حدیثِ رسول ہے کہ نہیں؟ —— اس لئے کہ یہ حدیث ہو کہ نہ ہو، لیکن اس کا جو مضمون ہے وہ واقعیّت اور حقیقت پر مبنی ہے۔ ہر طبعِ سلیم و فہمِ مستقیم تجربات و مشاہدات اور شعور و ادراک کی روشنی میں اس مضمون کی تائید و توثیق پر مجبور ہے۔

حدیث زیرِ شرح کے ضمن میں اور خاص طور پر فائدہ ۵ کے تحت مختلف عبارتوں اور نئے نئے انداز سے محبت کی تعریفیں کی گئی ہیں اور محبت کو سمجھانے کے لئے طرح طرح کے اُسلوب اختیار کئے گئے ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ چہرۂ محبت سے پوری نقاب کشائی نہ ہوسکی اور کوئی ایسی تعریف نہ کی جاسکی جس سے محبت کی کیفیت کا صحیح عرفان ہوسکے —— محبت کی جس تعریف پر بھی آپ غور کریں گے۔ کسی سے بھی آپ کو اس کیفیت کا ادراک نہ ہوسکے گا جس کا نام محبت ہے —— ہاں —— ذکر کی ہوئی جملہ تعریفوں میں تعریف ۱۳ سے محبت کے حقیقی معنی کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ محبت نام ہے میلانِ قلب اور تعلقِ خاطر کا —— اس سے بھی محبت کا معنی ہی سمجھا گیا، نہ کہ اس کی کیفیت —— رہ گئیں اس کے سوا محبت کی دوسری تعریفیں، تو ان میں سے کسی تعریف سے آپ کو محبت کے اسباب و موجبات کا پتہ چل جائے گا، کسی سے اس کی علامات و شواہد کی معرفت ہو جائے گی، کسی سے اس کے آثار و ثمرات کی نشاندہی

ہو جائے گی اور کسی میں اس کے احکام وغیرہ کی تشریح و توضیح مِل جائے گی۔

چہرۂ محبت سے نقاب کشائی نہ ہو سکنے کا سبب یہ ہے کہ محبت خالص وِجدانی چیز ہے جس کی تعبیر لفظوں سے نہیں کی جا سکتی۔ احساسات کو الفاظ و عبارات کے شکنجے میں نہیں جکڑا جا سکتا۔ بُوئے گُل کو فولاد کی زنجیروں کا پابند نہیں بنایا جا سکتا ہے ؎

نقشِ الفاظ میں احساس کی تصویر کہاں
بُوئے گُل کے لئے فولاد کی زنجیر کہاں

بعض محققین کا ارشاد ہے کہ محبت اہلِ معرفت کے نزدیک ایک ایسی بدیہی حقیقت ہے جو منّت کشِ تعبیر نہیں ہو سکتی، یہ سمجھانے سے سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ اس کی صحیح معرفت اُسی کو اپنے وِجدان کے ذریعہ ہو سکتی ہے جو خود اسیرِ محبت ہو ——— دَولتِ محبت سے جو تہی دست ہے، محبت کو سمجھنے کی اس کی کوشش ایسی ہی ہے جیسے کوئی شراب پئے بغیر اس کے نشے کی کیفیت کا پتہ لگانا چاہے ——— یا ——— خود کو آگ میں جلائے بغیر آگ کی حرارت کو لفظوں اور عبارتوں سے سمجھنا چاہے وغیرہ وغیرہ ——— ایک وِجدانی حقیقت کو عقل سے سمجھنے کی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اور پردۂ خفاء میں پہونچ جاتی ہے۔ اور فہم وادراک اس کی معرفت سے بہت دُور ہو جاتے ہیں ———

المختصر ——— محبت کی کوئی ایسی تعریف نہیں کی جا سکتی جو خود اسی "لفظِ محبت" سے زیادہ واضح ہو۔ خود محبت کرنے والا محبت کو اپنے وِجدان سے سمجھ تو لیتا ہے لیکن اپنے لفظوں سے سمجھا نہیں سکتا۔ سچ کہا کہنے

والوں نے " الحسن یدرك، لا یوصف " خوبصورتی سمجھی جاتی ہے، بیان نہیں کی جاتی۔ یعنی ایسی عبارت میں اس کا بیان ممکن نہیں جو مخاطب کو وہ سمجھا دے جو خود بیان کرنے والا اپنے مشاہدہ وعلم سے سمجھ چکا ہے۔

(۶) ـــــ زرقانی شرح مواہب ج ۶ ص ۳۲۱ میں ہے:

" (اذکان الانسان یحب من منحه) "

ای اعطاه (فی دنیاه) ای حیاته فی الدنیا (مرة اومرتین معروفا) ای شیئًا حسنا۔ (فانیا منقطعا) ای زائلا فی زمن قلیل (اواستنقذه) نجاه (من مهلکة) امر مُهلك (اومضرة) بفتح المیم والضاد أمر یضره ویوذیه (لاتدوم (مدة ذلك (فما بالك بمن منحه منحا لا تبید) بکسر الموحدة واسکان التحتیة لا تذهب وتنفد (وَ لَا تزول) عطف تفسیر من نعیم الخلد فی الجنة (ووقاه) بالتشدید والتخفیف صانه (من العذاب الالیم) عذاب النار (مالا یفنی ولا یحول) عنه الی غیره فهذا احق ان یحب من کل شیئ یحب حتی من نفسه وماله واهله (واذ کان المحب یحب غیره علی) ای لاجل (ما فیه من صورة جمیلة و

سیرۃ حمیدۃ) کملک وقاض وان کان
بعید الدار عنه ولم یره (فکیف بهذا
النبی الکریم والرسول العظیم' الذی لا
اکرم ولا اعظم منه (الجامع لمحاسن الا
خلاق والتکریم المانح) المعطی (لنا جوامع
المکارم والفضل العمیم فقد اخرجنا الله
به من ظلمات الکفر الی نور الایمان) بالاضافة
البیانیة فیهما او من اضافة الاعم الی الاخص
(وخلصنا به من نار الجهل الی جنات المعارف
والایقان فهو السبب لبقاء مهجتنا) بضم
ففتح (البقاء الابدی) الدائم (فی النعیم
السرمدی) ای المتواصل الذی لا ینقطع
(فایّ احسان اجل قدراً) رتبة (و اعظم
خطرا) بفتح الخاء المعجمة والطاء المهملة
ای قدرا أو شرفا غایر بینهما تفننا (من
احسانه الینا) معاشر المسلمین وخصهم
لانهم هم المنتفعون به وان کان احسانه
عامًا وَ ای للتعظیم والتفخیم کما یقال عندی
رجل أی رجل ای کامل الوجولیة (فلامنة و
حیاته) قسمی (لاحد بعد الله کماله علینا

ولا فضل لبشر) ولا لملك (كفضله لدينا)
عندنا وقيد بالبشر لانه المشاهد فضله
(فكيف ننهض) نقوم بسرعة (ببعض شكره)
على ما أولانا (او) كيف (نقوم من واجب
حقه بمعشار عشره فقد منحنا الله بد منح
الدنيا والآخرة واسبغ) اوسع واتم (علينا)
بسببه (نعمه) اى الله (باطنة) وهى المعرفة
وغيرها (وظاهرة) حسن الصورة وتسوية
الاعضاء (فاستحق صلى الله عليه وسلم ان يكون
حظه) نصيبه (من محبتنا او فى) اتم (وازكى)
اطهر (من محبتنا لانفسنا واولادنا واهلينا
واموالنا والناس اجمعين) عطف عام على خاص
وهو كثير (بل) انتقال (لو كان فى كل منبت)
محل نبات (شعرة منا محبة تامة له صلوات الله
وسلامه عليه لكان ذلك بعض ما يستحقه
علينا)''۔

"جب انسان محبت کرتا ہے اُس سے جو اسے اس کی حیاتِ
دُنیوی میں ایک بار یا دو بار کوئی اچھی چیز عطا کر دے، ایسی چیز
جو تھوڑے ہی زمانہ میں فنا ہو جانے والی ہو ——— یا
وہ اسے کسی مہلک امر یا اذیت دینے والی چیز سے جو ہمیشہ

رہنے والی نہیں، نجات دیدے —— تو پھر ——
کیا تمہارا خیال ہے اس کے بارے میں جس نے انسان کو
ایسی نعمتیں عطا فرمائی ہیں جو نہ ہلاک ہونے والی ہیں
اور نہ ختم ہونے والی، یعنی جنت کی لازوال نعمتیں ——
اور اس نے انسان کو اس دردناک عذابِ جہنّم سے
بچایا جو نہ فنا ہونے والا ہے اور نہ کسی غیر کی طرف پھر جانے
والا ہے۔
تو ایسا مُحسن اس بات کا پورا حق رکھتا ہے، ہر محبوب شے
یہاں تک کہ اپنی جان، اپنے مال اور اپنی اہل سے بھی زیادہ
اس کی محبت کی جائے —— اور جب ایک
چاہنے والا اپنے غیر سے اچھی صورت اور اچھی سیرت کی وجہ
سے محبت کرتا ہے خواہ وہ اس سے دُور رہتا ہو اور اس نے
اس کو دیکھا بھی نہ ہو۔ مثلاً بادشاہ اور حاکم وغیرہ ——
تو کیسی شان ہوگی اُس نبی کریم اور رسُول عظیم کی
جس سے بڑھ کر نہ کوئی کرم والا ہے نہ عظمت والا جو تمام
محاسنِ اخلاق و تکریم کا جامع ہے اور جو ہمیں فضلِ عمیم اور
جوامع المکارم کا عطا کرنے اور فرمانے والا ہے پس بے شک
اللہ تعالےٰ نے ہم کو آپ کے ذریعہ کُفر کی ظلمتوں سے نکال کر
ایمان کے نور تک پہونچایا اور آپ ہی کے ذریعہ جہالت و نادانی
کی بھڑکتی ہوئی آگ سے ہم کو چھٹکارا دلا کر علم و یقین اور

معارف و ایقان کے سرسبز باغوں میں پہونچا دیا۔ پس آپ ہی لازوال آسودہ حالی اور غیر فانی آرام میں ہمارے چہروں کی رونق و شادابی کی بقاءِ دوام کا سبب ہیں۔ پس وہ کون سا احسانِ عظیم ہے جو شرف اور مرتبہ میں اس احسان سے بھی زیادہ جلیل ہو جو آپ نے سب پر بالخصوص ہم پر فرمایا ہے۔ پس قسم ہے آپ کی حیاتِ طیّبہ کی کہ خدا کے بعد آپ نے جو ہم پر احسان فرمایا ہے اس سے بڑھ کر اور بالاتر کسی کا بھی احسان نہیں اور کسی انسان یا کسی فرشتہ کا فضل و کرم آپ کے فضل و کرم جیسا نہیں جس سے آپ نے ہمیں نواز ہے۔ آپ نے ہم کو جو نعمتیں عطا فرمائی ہیں اور جو احسانات کئے ہیں اس پر شکر کے بعض حصّے سے بھی ہم یکبارگی کیسے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں اور آپ کے واجب الادا حقوق عشر عشیر بھی ہم کیسے ادا کر سکتے ہیں۔ بے شک اللہ نے آپ کے ذریعہ دُنیا و آخرت کی نعمتوں کو ہم پر سے ہم کو نواز اور آپ ہی کے سبب سے اللہ نے اپنی نعمتوں کو وسیع اور مکمل فرما دیا باطن میں علم و معرفت دے کر اور ظاہر میں حُسنِ صورت اور اعضاء کا تناسب عطا فرما کر تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس بات کا پورا حق رکھتے ہیں کہ ہم کو اپنی ذات، اپنی اولاد، اپنی زوجہ، اپنے اموال اور تمام لوگوں سے جتنی اور جیسی محبت ہے، اس سے کہیں زیادہ

پاکیزہ اور اس سے کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر کامل و اکمل
محبت آپ کی ذات سے ہو۔ اگر ہمارا ہر بُنِ مُو آپ
صلی اللہ علیہ وسلم کی محبّتِ تامّہ کا حامل ہو جائے تو کہیں
جا کے آپ کے جملہ حقوق کا بعض حصّہ ادا ہو۔"

خیر الاتقیا، حضرت علّامہ فقیہ و امام قاضی ابُو الفضل عیاض
بن موسیٰ بن عیاض مالکی اندلسی المتولد ۴۹۶ھ والمتوفی ۵۴۴ھ قدس
سرّہٗ العزیز اپنی عظیم تصنیف "کتاب الشفاء بتعریف حقوق المصطفٰی"
میں نبیٔ کریم سے محبت کے معنی و حقیقت کی وضاحت اور پھر نبی کریم
علیہ التحیۃ والتسلیم کی محبوبیت کی تشریح یوں فرماتے ہیں :

" اختلف الناس فی تفسیر محبۃ اللہ ومحبۃ النبّی
صلی اللہ علیہ وسلّم وکثرت عباراتھم فی
ذالک ولیست ترجع بالحقیقۃ (و فی نسخۃٍ
فی الحقیقۃ) الی اختلاف مقال ولکنھا اختلاف
احوال فقال سُفیٰن المحبۃ اتباع الرّسُول
صلی اللہ علیہ وسلم کانہ التفت الی قولہ
تعالیٰ قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی الآیۃ
وقال بعضھم محبۃ الرّسُول اعتقاد نصرتہٖ
والذب عن سنتہٖ والانقیاد لھا وفی نسخۃ
لہ ھیبۃ لمخالفتہ وقال بعضھم المحبۃ ـــ

دوام الذكر للمحبوب (وفي نسخة ذكر المحبوب)
وقال آخر ايثار المحبوب وقال بعضهم
المحبة الشوق الى المحبوب وقال بعضهم
المحبة مواطاة القلب لمراد الرب يحب
ما احب (وفي نسخة يحب) ويكره ماكره
(وفي نسخة يكره) وقال آخر المحبة ميل
القلب الى موافق له واكثر العبارات المتقدمة
اشارة الى ثمرات المحبة دون حقيقتها و
حقيقة المحبة الميل الى ما يوافق الانسان و
تكون موافقته له اما لاستلذاذه بادراكه
كحب الصور (وفي نسخة الصورة) الجميلة
والاصوات الحسنة والاطعمه والاشربه
اللذيذة واشباههما مما كل طبع سليم
مائل اليها لموافقتها له اولاستلذاذه بادراكه
بحاسة عقله وقلبه معانى باطنة شريفة
كحب الصالحين والعلماء واهل المعروف
والماثور عنهم السير الجميلة والافعال الحسنة
فان طبع الانسان مائل الى الشغف بامثال
هؤلاء حتى يبلغ التعصب لقوم (وفي نسخة
حين يبلغ التعصب لقوم) والتشيع من امة

فی اخرٰی (وفی نسخۃ اخرٰی) ما یؤدّی
الی الجلاء عن الاوطان وھتک الحرم و
احترام النفوس او یکون حبہ ایاہ لموافقتہ
لہ (الیہ) من جہۃ احسانہ لہ وانعامہ
علیہ فقد جبلت النفوس علی حب من احسن
الیہا (الیہ) فاذا تقرر لک ھذا نظرت
ھذہ الاسباب کلہا حقہ صلی اللہ علیہ وسلم
فعلمت انّہ صلی اللہ علیہ وسلم جامع لھذہ
المعانی الثالثۃ الموجبۃ للمحبّۃ جمال الصورۃ
والظاھر وکمال الاخلاق والباطن فقد
قرّرنا منہا قبل فیما من الکتاب ما لا یحتاج
الی زیادۃ واَمّا احسانہ وانعامہ علی امتہ
فکذلک قد مرمنہ فی اوصاف اللہ تعالٰی
لہ من رافتہ بہم ورحمۃ لہم وھدایتہ
ایّاھم وشفقتہ علیہم واستنقاذھم
بہ من النّار وانّہ بالمومنین رؤف رحیم
ورحمۃ للعالمین ومبشرا ونذیرا وداعیًا
الی اللہ باذنہ ویتلو علیہم الکتاب والحکمۃ
ویھدیہم الی صراط مستقیم فایّ احسان
اجل قدرا واعظم خطرا من احسانہ الی

جميع المومنين واىّ افضال اعم منفعة
واكثر فائدة من انعامه على كافة المسلمين
اذ كان ذريعتهم الى الهداية ومنقذهم
من العماية وداعيهم الى الفلاح والكرامة
ووسيلتهم الى ربهم وشفيعهم والمتكلم
عنهم والشاهد لهم والموجب (والمحبّ)
لهم البقاء الدائم والنعيم السرمد فقد
استبان لك انّه صلى الله عليه وسلم مستوجب
للمحبة الحقيقة شرعًا بما قدمناه (المأمر)
من صحيح الآثار وعادةً وجبلةً بما ذكرناه
انفًا لافاضته الاحسان وعمومه الاجمال
فاذا كان الانسان يحب من منحه في
دنياه مرة او مرتين معروفًا او استنقذه
(او انقذه) من فتهالكة او مضرة مدّة
التاذى بها قليل منقطع فمن منحه ما
لا يبيد من التّعيم (من النعيم) ووقاه
ما لا يفنىٰ من عذاب الجحيم اولىٰ بالحبّ
(بالمحبّة) واذ كان يحب بالطبع ملك لحسن
سيرته لما يوثر من قوام طريقته او قاض
بعيد الدار لما يشاد (فشا) من علمه او

کرم شمیته فمن جمع هذه الخصال علی غایة
مراتب الکمال احق بالحب و اولی بالمیل و
قد قال علی رضی اللہ عنه فی صفته صلی اللہ
علیه وسلم من راہ بدیهة هابه و من
خالطه معرفة احبّه و ذکرنا عن بعض
الصحابة انّه کان لا یصرف بصرہ عنه
محبة فیه -

(الشفاء)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرنے کے معنی
اور اس کی حقیقت کے بیان میں علماء کا اختلاف ہے کہ اللہ
اور اس کے نبی کی محبت کی کیا تفسیر و مُراد ہے ان کی عبارتیں
تو بکثرت ہیں لیکن حقیقت میں کچھ اختلافِ اقوال نہیں، البتّہ
احوال و کیفیات ضرور مختلف ہیں۔ چنانچہ حضرت شفیان
رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ محبت رسُولِ کریم علیہ التحیۃ والتسلیم کی
اتباع کا نام ہے۔ غالباً انہوں نے اللہ کے اس فرمان کی طرف
توجہ فرمائی ہے، ارشادِ ربّانی ہے:

"فرما دو اگر تم اللہ کو محبوب رکھتے ہو تو میری
اتباع کرو۔"

بعض علماء نے فرمایا کہ رسُول کی محبت یہ ہے کہ
آپ کی نُصرت و مدد کو لازم جانے، آپ کی سُنّت کی حمایت

کرے، سُنّت کی پیروی کرے اور سُنّت کی مخالفت سے خوفزدہ رہے۔ بعضوں نے کہا کہ ہمیشہ محبوب کا ذکر کرتے رہنے کا نام محبت ہے۔ اور دوسروں نے کہا کہ محبوب پر جان نثاری محبت ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ محبت محبوب کی طرف شوق کا نام ہے۔ اور بعض فرماتے ہیں کہ محبت یہ ہے کہ دل رب تعالےٰ کی مُراد کے موافق کرے کہ جس کو وہ پسند کرے اُس کو یہ پسند کرے، جس کو وہ بُرا کہے اُس کو یہ بُرا جانے۔ بعضوں نے کہا کہ طبیعت کے موافق چیزوں کی طرف دل کے میلان کا نام محبت ہے۔

مذکورہ اکثر عبارتیں محبت کے نتیجہ و ثمرہ کی طرف اشارہ کر رہی ہیں نہ کہ اس کی حقیقت کی طرف۔ اور محبت کی حقیقت یہ ہے کہ جو چیز طبعِ انسانی کے موافق ہو اس کی طرف اس کا میلان ہو۔ اب اس کی یہ موافقت یا تو اس لئے ہوگی کہ اُس کے پالینے سے اُس کو حسّی لذّت حاصل ہوگی جیسے حسین و جمیل صورتیں، عمدہ آوازیں اور لذیذ کھانا پینا وغیرہ کہ ہر سلیم الطبع اس کی طرف مائل ہے کیونکہ یہ سب اسکی طبیعت کے موافق ہیں ـــــ یا ـــــ اس لئے کہ برتر و اعلیٰ معانیٔ باطنی کو حاسّۂ عقل و قلب کے ذریعہ پانے سے وہ معنوی لذت حاصل کرتا ہے جیسے علماء و صلحاء و عرفاء اور اُن لوگوں کی محبت جن کی سیرتوں کی پاکیزگی مشہور ہے اور

ان کے افعال پسندیدہ ہیں کیونکہ طبع انسانی ان امور کی طرف مائل ہے یہاں تک کہ ایک طبقہ کی محبت کی وجہ سے دوسرے طبقہ سے تعصب تک کی نوبت پہونچ جاتی ہے اور ایک گروہ کی حمایت دوسرے کے حق میں اس حد تک تجاوز کر جاتی ہے کہ اس کی محبت میں جلا وطنی (ترکِ سکونت)، بڑوں کی ہتک اور جانوں کو ہلاک کر دیتے ہیں ــــــ یا ــــــ اس کی محبت اس لئے ہوتی ہے کہ اس کے احسان و انعام کی وجہ سے اس کی طبیعت اس کے موافق ہو جاتی ہے ۔ کیونکہ طبائع انسانیہ اسی پر پیدا کی گئی ہیں کہ جو شخص اس پر احسان کرے وہ اس سے محبت کرے ــــ جب یہ حقیقت تم پر آشکارا ہو چکی تو اب ان تمام اسباب و علل کے لحاظ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان تینوں معانی کے جو محبت کرنے کے موجب اور سبب ہیں جامع ہیں چنانچہ آپ کی ظاہری صورت کا جمال، کمال اخلاق اور باطنی خوبیاں ہم پہلے حصہ میں اچھی طرح ثابت کر چکے ہیں مزید بیان کی اصلاً حاجت نہیں، اب رہا آپ کا اپنی اُمّت پر احسان و انعام سو وہ بھی پہلے حصہ میں گذر چکا ہے ۔ جہاں اللہ تعالےٰ نے اُمّت پر آپ کی شفقت و رحمت کے اوصافِ حسنہ بیان فرمائے ہیں کہ کس طرح ان کو ہدایت فرمائی اور کیونکر ان پر شفقتیں کیں اور خدا نے ان کو کیسے دوزخ سے آپ کی وجہ سے

بچایا اور یہ کہ آپ مسلمانوں کے ساتھ رؤف و رحیم اور
رحمۃ للعالمین اور یہ کہ آپ مبشر، نذیر اور باذنِ الٰہی داعی
الی اللہ ہیں آپ نے ان پر اللہ کی آیتیں تلاوت فرمائیں
ان کا تزکیہ نفس کیا اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دے کر
صراط مستقیم کی ہدایت فرمائی (وغیرہ وغیرہ جو سب پہلے
مذکور ہو چکا ہے) تو اب وہ کون سا احسان ہے جو مسلمانوں
کے لئے آپ کے احسان سے بڑھ کر قدر و منزلت والا ہے اور
کون سی کرم گستری ایسی ہے جو منفعت کے اعتبار سے تمام
مسلمانوں پر آپ کے انعام سے زیادہ عام اور سُود مند ہو۔
کیونکہ آپ ہی تو ان کی ہدایت کا ذریعہ تھے۔ آپ ہی تو ان کو
جہالت و ضلالت سے نکالنے والے اور فلاح و کرامت کی طرف
بلانے والے تھے اور آپ ہی تو ان کے رب کی طرف وسیلہ،
شفیع اور ان کی طرف سے کلام کرنے والے ہیں اور آپ ہی
ان کے گواہ اور ان کی دائمی بقا اور لازوال نعمتوں کے
موجب ہیں۔ یقیناً اب تم کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ حضور
صلی اللہ علیہ وسلم حقیقی محبت کے از روئے شرع بھی مستحق و
مستوجب ہیں جیسا کہ ہم پہلے صحیح حدیثوں سے بیان کر چکے ہیں
اور از روئے طبیعت و عادت بھی۔ جیسا کہ ابھی ہم نے ذکر
کیا، کیونکہ آپ کے احسانات عام ہیں۔ پس جب انسان
اُس شخص کو محبوب رکھتا ہے جو دُنیا میں اُس پر ایک یا دو دفعہ

احسان کرے یا اُس کو کسی ہلاکت و نقصان سے بچائے جس کی ایذا کی مدّت تھوڑی اور کسی نہ کسی وقت منقطع ہونے والی ہو، تو جو ذاتِ کریم اس کو وہ نعمتیں مرحمت فرمائے جو کبھی ختم نہ ہوں اور اس کو دوزخ کے ایسے عذاب سے بچائے جو کبھی فنا نہ ہو تو وہی محبت کرنے کے زیادہ لایق و مستحق ہے۔ اور جب انسان طبعی طور پر اُس بادشاہ کو جو اچھی خصلت رکھتا ہو یا وہ حاکم جس کا حُسن سلوک معروف ہو۔ یا وہ قاضی جو دُور ہو مگر اس کا علم و کرم اور عمدہ خصلتیں مشہور ہوں، محبوب رکھتا ہے تو وہ ذاتِ اقدس جس میں یہ تمام خصائلِ جلیلہ کمال کے انتہائی مرتبہ تک مجتمع ہوں، زیادہ محبت کی مستحق ہے اور زیادہ لایق ہے کہ اس کی طرف طبیعت مائل ہو۔ مولائے کائنات سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے وصفِ پاک سے متعلق ارشادِ گرامی ہے کہ جو شخص آپ کو اچانک دیکھتا وہ خوف زدہ ہو جاتا اور جسے آپ کی جان پہچان حاصل ہو جاتی وہ آپ سے محبت کرنے لگتا۔ ہم نے بعض صحابہ سے متعلق پہلے بیان کیا ہے کہ وہ آپ کی محبت کی وجہ سے آپ کی طرف سے آنکھیں نہ پھیرتے تھے۔

حضور نبی کریم صلی اللہ تعالٰے علیہ وسلم کی محبت لازم وضروری ہے چنانچہ ارشادِ ربّانی ہے :

قل ان کان آباؤکم و ابناؤکم و اخوانکم و ازواجکم و عشیرتکم واموال ن اقترفتموھا و تجارۃ تخشون کسادھا ومساکن ترضونھا احب الیکم من اللہ ورسولہ وجھاد فی سبیلہ فتربّصوا حتی یاتی اللہ بامرہ واللہ لایھدی القوم الفٰسقین ۔

تم فرماؤ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری عورتیں اور تمہارا کُنبہ اور تمہاری کمائی کے مال اور وہ سودا جس کے نقصان کا تمہیں ڈر ہے اور تمہارے پسندیدہ مکانات، اللہ اور اس کے رسُول اور اس کی راہ میں لڑنے سے زیادہ پیاری ہوں تو راستہ دیکھو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم لائے اور اللہ فاسقوں کو راہ نہیں دیتا ۔

صاحبِ مرآت شرح مشکوٰۃ اپنی گرانقدر تالیف "نورالعرفان فی حاشیۃ القرآن" میں ان آیات کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

"اس سے معلوم ہوا کہ کافرہ بیوی (جب کہ اس سے نکاح جائز تھا) اور کافر ماں باپ وغیرہ اہلِ قرابت کے حقوقِ شرعیہ ادا کرنا جائز ہے ۔ مگر ان سے دلی محبت کرنا حرام ہے ۔

دل کا میلان اللہ اور رسول کے دشمنوں کی طرف نہ ہونا چاہئے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ کفّار سے دلی محبت رکھنا کفر ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ جب خالق و مخلوق کے حقوق کا مقابلہ ہو جاوے تو خالق کا حق مقدم ہے —— عشیرۃ میں سالے سسرالی، نسبتی قرابت دار، اور قومی بھائی داخل ہیں۔ مال میں کمائی کا ذکر اس لئے فرمایا کہ اپنی کمائی کا مال میراث وغیرہ سے زیادہ پیارا ہوتا ہے کیونکہ محنت سے ملتا ہے —— اس سے معلوم ہوا کہ دنیاوی چیزوں سے محبت کرنا حرام نہیں، ہاں اللہ و رسول کے مقابلہ میں ان سے محبت کرنی حرام ہے۔ ناجائز محبتیں بھی حرام ہیں ——

اس آیت کی تفسیر وہ حدیث ہے کہ فرمایا حضور نے تم میں سے کوئی اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اُسے ماں باپ، اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ پیارا نہ ہو جاؤں۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضور سے طبعی محبت چاہئے نہ کہ محض عقلی۔ کیونکہ انسان کو اولاد وغیرہ سے طبعی محبت ہوتی ہے۔ یہاں اس سے مقابلہ فرمایا گیا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ رسول اللہ سے محبت اس قسم کی چاہئے جس قسم کی محبت اللہ سے ہوتی ہے یعنی عظمت و اطاعت والی — یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ کے ساتھ حضور سے محبت کرنی شرک نہیں بلکہ ایمان کا رُکن ہے — یہ بھی معلوم ہوا کہ دل میں

حضور کی محبت نہ ہونا کفر ہے کیونکہ اس پر عذاب کی وعید ہو رہی ہے۔"

حضرت قاضی عیاض علیہ الرحمۃ والرضوان مذکورہ بالا آیات قرآنیہ کو نقل فرما کر رقم طراز ہیں:

فکفی بھذا حضا و تنبیھا و دلالۃ و حجۃ علی الزام محبتہ (التزام محبتہ) و وجوب فرضھا و عظم خطرھا و استحقاقہ لھا صلی اللہ علیہ وسلم اذ قرع تعالیٰ من کان مالہ و اھلہ و ولدہ احب الیہ من اللہ و رسولہ و اوعدھم بقولہ تعالیٰ فتربصوا حتی یاتی اللہ بامرہ فسقھم بتمام الآیۃ واعلمھم انھم ممن ضل ولم یھدہ اللہ وعن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ انہ قال النبی صلی اللہ علیہ لانت احب الی من کل شیء الا نفسی التی بین جنبتی فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم لن یومن احدکم حتی اکون احب الیہ من نفسہ فقال عمر والذی انزل علیک الکتاب لانت احب الی من نفسی التی بین جنبتی فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم الآن یا عمر قال سھل من لم یر ولایۃ الرسول فی جمیع الاحوال

ويرى نفسه فى ملكه صلى الله عليه وسلم لا يذوق حلاوة سنته لان النبى صلى الله عليه وسلم قال لا يومن احدكم حتى اكون احب اليه من نفسه ـــ الحديث۔

(الشفا)

یہ آیت کریمہ آپ کی محبت کے لزوم اور اس کے فرض واہم ہونے اور آپ ہی کو اس محبت کے اصل مستحق قرار دینے میں ترغیب و تنبیہہ اور دلیل و حجت کے لئے کافی ہے کیونکہ اللہ تعالے نے اس کی سخت سرزنش اور تنبیہہ کی ہے جس نے اپنی آل و اولاد اور مال کی محبت کو اللہ تعالے اور اس کے رسُول کی محبت سے زیادہ سمجھا ایسوں کو ڈراتے ہوئے اللہ تعالے نے فرمایا " تو راستہ دیکھو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم لائے"۔ آخر آیت میں ایسوں کو فاسق (بے ایمان) فرمایا اور جتلایا کہ یہ لوگ بلاشُبہ ان گمراہوں میں سے ہیں جن کو اللہ نے ہدایت کی توفیق نہ دی (حدیث زیر شرح اور حدیث حلاوۃ ایمان کو ذکر فرما کر لکھتے ہیں) حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک دن آپ نے حضور سے عرض کیا بے شک میرے نزدیک آپ میری جان کے سوا ہر چیز سے زیادہ محبوب ہیں۔ اس پر حضور نے فرمایا تم میں سے کوئی اُس وقت تک مومن ہو ہی نہیں سکتا جب تک وہ مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ محبوب

نہ بنالے۔ تو حضرت عمر نے عرض کیا قسم ہے اُس ذات کی جس نے آپ پر کتاب نازل فرمائی یقیناً آپ میری جان سے بھی زیادہ محبوب ہیں۔ اُس وقت حضور نے فرمایا اے عمر اب تم (کامل الایمان) ہو گئے۔ حضرت سہل فرماتے ہیں کہ جو شخص نبی کریم کی ولایت و حکومت تمام حالات میں نہیں دیکھتا اور اپنی جان کو آپ کی ملک نہیں تصور کرتا وہ حضور کی سُنّت کی شیرینی کو نہ چکھ سکے گا کیونکہ نبی کریم کا ارشاد ہے تم میں سے وہ شخص مومن نہیں ہو سکتا جس کے

علامہ نووی علیہ الرحمۃ والرضوان حدیث زیر شرح کے تحت اپنی شرح مسلم میں ارشاد فرماتے ہیں:

قال الامام ابوسلیمان الخطابی لم یرد بہ حبّ الطبع بل اراد بہ حبّ الاختیار لان حبّ الانسان نفسہ طبع ولا سبیل الی قلبہ قال فمعناہ لا تصدق فی حبی حتی تفنی فی طاعتی نفسک وتوثر رضائی علی ھواک وان کان فیہ ھلاکک ھذا کلام الخطابی وقال ابن بطال والقاضی عیاض وغیرھما رحمۃ اللہ علیھم المحبۃ ثلاثۃ

اقسام محبة اجلال و اعظام کمحبة الوالد و
محبة شفقة و رحمة کمحبة الولد و محبة
مشاکلة و استحسان کمحبة سائر الناس فجمع
صلی اللہ علیہ وسلم اصناف المحبة فی محبتہ
قال ابن بطال رحمۃ اللہ و معنی الحدیث ان
من استکمل الایمان علم ان حق النبی صلی اللہ
علیہ وسلم آکد علیہ من حق ابیہ و ابنہ
والناس اجمعین لان بہ صلی اللہ علیہ وسلم
استنقذنا من النار و ھدینا من الضلال قال
القاضی عیاض رحمۃ اللہ و من محبتہ صلی اللہ
علیہ وسلم نصرۃ سُنّتہ والذب عن شریعتہ و
تمنی حضور حیاتہ فیبذل و تمنی و دارکہ فی حیاتہ
لیبذل الخ (مرقات) مالہ و نفسہ دونہ قال و اذا
تبین ما ذکرناہ تبین ان حقیقتہ الایمان
لا یتم الا بذالک و لا یصح الایمان الا
بتحقیق اعلاء قدر النبی صلی اللہ علیہ وسلم
و منزلتہ علی کل والد و ولد و محسن و مفضل
و من لم یعتقد ھذا و اعتقد سواہ فلیس
بمؤمن ھذا کلام القاضی رحمۃ اللہ
واللہ اعلم۔ (نووی شرح مسلم)

امام ابو سلیمان خطابی فرماتے ہیں کہ حدیث پاک میں محبت سے حُبِ اختیاری مُراد ہے نہ کہ حُبِ طبعی، کیونکہ انسان کی اپنی ذات سے محبّت طبعی ہے جس کو پلٹ دینے کی کوئی صورت نہیں۔ امام موصوف فرماتے ہیں کہ حدیث پاک کا حاصل معنی یہ ہوا کہ " تم میری محبت میں اُس وقت تک سچے نہیں ہو سکتے جب تک کہ تم اپنے کو میری اطاعت میں فنا نہ کردو اور میری رضا کو اپنی خواہش پر ترجیح نہ دے لو اگرچہ اس میں تمہاری جان کی ہلاکت ہی کیوں نہ ہو "۔۔۔ مذکورہ باتیں خطابی کی ہیں۔ ابن بطال، قاضی عیاض اور ان کے سوا دوسرے علماء فرماتے ہیں کہ محبت کی تین قسمیں ہیں :- ایک " محبتِ اجلال و اعظام " مثلاً والد کی محبت۔ دوسری " محبتِ شفقت و رحمت " جیسے اولاد کی محبت۔ تیسری " محبتِ مشاکلت و استحسان " مثلاً تمام دوسرے لوگوں کی محبت (مشاکلت کہتے ہیں موافقت کو اور استحسان کا معنی ہے اچھا جاننا) تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام اقسامِ محبت کو اپنی محبت میں جمع فرما دیا۔ ابن بطال فرماتے ہیں کہ حدیث کا معنی یہ ہوا کہ جس نے اپنے ایمان کو مکمل کر دیا اس کو اس بات کا یقینی علم حاصل ہو گیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا حق اپنے باپ بیٹے اور دوسرے تمام لوگوں کے حقوق سے زیادہ موکّد ہے اس لئے کہ آپ ہی کے ذریعہ ہم کو

جہنّم سے اللہ تعالیٰ نے نجات دی اور گمراہی سے الگ کر کے ہدایت کی راہ پر گامزن کیا۔ قاضی عیاض علیہ الرحمۃ کا ارشاد ہے کہ نبی کریم کی سُنّت کی نصرت آپ کی شریعت کی حمایت پر، آپ پر جان و مال قربان کرنے کے لئے آپ کی حیاتِ طیبہ میں آپ تک پہونچنے کی آرزو اور تمنا، یہ سارے امور آپ کی محبت کی علامتیں ہیں۔ قاضی موصوف فرماتے ہیں جب ہمارے ذکر کردہ امور واضح ہوگئے تو ظاہر ہو گیا کہ نفس ایمان کا کمال انہی سے ہے اور ایمان اُس وقت تک صحیح نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس بات کی تصدیق نہ کر دی جائے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قدر و منزلت تمام باپ، بیٹوں، احسان اور فضل کرنے والوں پر بلند و برتر ہے۔ جس نے اس کا اعتقاد نہیں کیا بلکہ اس کے سوا کسی اور چیز کا معتقد ہوا تو وہ مومن ہی نہیں ـــــ یہ حضرت قاضی عیاض رحمۃ اللہ کا ارشاد ہے۔ واللہ اعلم

حُبّ طبعی اور حُبّ اختیاری کی تقسیم کے متعلق فائدہ ۱۲ کے ضمن میں اپنے معروضات پیش کر چکا ہوں ـــــ رہ گئیں زرقانی اور نووی کی منقولہ عبارتیں تو وہ اس قدر واضح ہیں کہ ان کی مزید تشریح کی قطعی ضرورت نہیں۔ ان تمام عبارتوں پر غور کرنے سے یہ بات بخوبی معلوم ہو جاتی ہے کہ اس امر میں سارے علماء کا اتفاق ہے کہ نبی کریم علیہ التحیۃ والتسلیم

کی محبت لازم و ضروری ہے۔ اب پہلا اختلاف یہاں سے شروع ہوتا ہے کہ قرآن حکیم اور احادیثِ کریمہ میں نبی کریم کی ذات اقدس سے محبت کرنے کا جو حکم ملتا ہے آخر وہ کس طرح کی محبت کا حکم ہے؟ — حُبِّ عقلی کہ حُبِّ طبعی؟ (خیال رہے کہ یہ گفتگو اس مفروضے پر ہے کہ بنام حُبِّ عقلی بھی محبت کی ایک قسم ہے)۔ اس کے بعد دوسرا اختلاف یہاں سے شروع ہوتا ہے کہ قرآن و احادیث کے ذریعہ جو محبتِ نبوی مطلوب ہے، وہ نفس ایمان کے لئے ضروری ہے یا کمالِ ایمان کے لئے؟

امام ابوسلیمان خطابی کا خیال ہے کہ یہاں حُب سے حُبِّ عقلی، بلفظِ دیگر حُبِّ اختیاری مُراد ہے جیسا کہ حوالہ گذر چکا ہے۔ اکثر و بیشتر علماء نے امام خطابی ہی کے خیال کی تائید فرمائی ہے، چنانچہ آیت کریمہ احبّ الیکم من اللہ و رسولہ کی تفسیر کرتے ہوئے صاحبِ تفسیر ابی سعود اور صاحبِ تفسیر روح البیان رقم طراز ہیں:

(اَحَبَّ اِلَیْکُمْ مِنَ اللّٰہِ وَ رَسُوْلِہٖ)
بالحب الاختیاری (المراد الحب الاختیاری الخ روح البیان) المستتبع لاثرہ الذی ھو الملازمۃ وعدم المفارقۃ لا الحب الجبلی الذی لا یخلو عنہ البشر فانہ غیر داخل تحت التکلیف الدائر علی الطاقۃ۔ (ابوسعود)

آیت کریمہ میں محبت سے مراد حُبِّ اختیاری ہے جو اپنے اثر یعنی محبوب سے چمٹے رہنے اور نہ جُدا ہونے (وغیرہا) کے اپنے

پیچھے پیچھے چلنے کی داعی ہے۔ یہاں محبت سے مُراد طبعی محبت نہیں
جس سے کوئی فردِ بشر خالی نہیں۔ حُبِّ طبعی کے مُراد نہ لینے
کی وجہ یہ ہے کہ تکلیف جس کی بُنیاد استطاعت ہے اس کے
تحت یہ محبت داخل نہیں۔

ان تائید کرنے والوں کے علاوہ بھی بعض جلیل القدر مُؤیّدین کا ذکر میں
پہلے ہی کر چکا ہوں ـــــــ یہ سارے عُلماء حُبِّ عقلی کو حُبِّ طبعی
کا قسیم اور مدّمقابل قرار دیتے ہیں اور حُبِّ عقلی کی جو تعریف کرتے ہیں اس
سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حُبِّ عقلی محبت کی ایک ایسی قسم ہے جس میں اوّل
سے آخر تک عقل کی کار فرمائی ہے اور اس میں طبیعت کی مداخلت یا بلفظِ
دیگر طبعی میلان کا ذرّہ برابر بھی شائبہ تک نہیں۔ نیز جس کا وجود کراہتِ
طبع کے ساتھ بھی ہو جاتا ہے۔ ورق اُلٹ کر دیکھئے فائدہ ۴ کے ضمن
میں مرقات اور زرقانی کی ان تعریفوں کو اور ان مثالوں کو جن کے
ذریعہ حُبِّ عقلی کی تفہیم کرائی گئی ہے مجھے یقین ہے کہ ان تعریفوں اور پھر
ان مثالوں پر غور کر لینے کے بعد آپ میری مذکورہ بات کی تائید فرمائیں گے
ـــــــ اور پھر آپ یہ بخوبی سمجھ لیں گے کہ حُبِّ عقلی اور حُبِّ طبعی کی
تقسیم سے متعلق فائدہ ۴ کے ضمن میں ان علمائے کرام کی بارگاہ میں
میں نے جو معروضہ پیش کیا ہے اس کی بنیاد نزاعِ لفظی پر نہیں۔

اس مقام پر مناسب سمجھتا ہوں کہ اس بات کی بھی وضاحت
انہی علمائے کرام کی تحریروں کی روشنی میں کر دوں کہ آخر کس حکمت و
مصلحت کے پیشِ نظر ان حضرات نے اس تقسیم کی ضرورت سمجھی اور پھر

حُبِّ عقلی کی داغ بیل ڈالی۔ نیز حُبّ عقلی میں میلانِ طبع کی ادنیٰ شرکت بھی گوارا نہیں فرمائی ——— بات یہ ہے کہ قرآن و حدیث میں جا بجا مختلف انداز میں خدا و رسُول کی محبت کا حکم دیا گیا ہے اور اس کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔ نیز ہر مکلّف کو محبتِ خدا و رسُول کی تکلیف دی گئی ہے۔ اب جب ہم محبت کے لغوی معنیٰ کی تحقیق کے لئے کُتب لُغت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو مصباح اللغات کو یہ کہتے ہوئے سُنتے ہیں :

المحبۃ :۔ مرغوب چیزوں کی طرف طبیعت کا میلان ———

اقرب الموارد یوں آواز دیتی ہے :

(المحبّۃ) میل الطبع الی الشیء الملذ ویقابلها البغض وهو نفور الطبع من المولم المتعب ۔

(اقرب الموارد)

محبت نام ہے مرغوب و لذیذ شے کی طرف طبیعت کے میلان کا۔ محبت کا مقابل بغض ہے۔ تکلیف دینے والی اور مشقت میں ڈالنے والی چیزوں سے طبیعت کا دُور بھاگنا بغض ہے۔

کُتب لُغت سے الگ ہو کر جب عُرف عام کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو وہاں بھی محبت کے لفظ سے جو معنی سمجھا جاتا ہے وہ تعلق خاطر اور میلانِ طبع ہی ہے ———

اور یہ بھی ظاہر ہے کہ طبیعت کا میلان ایک غیر اختیاری عمل ہے اور غیر اختیاری اعمال بداہتہً انسانی دائرہ استطاعت سے باہر ہیں۔ پس

جو چیز انسانی طاقت سے باہر ہو، انسان کو اس کے کرنے پر مجبور کرنا اور انسان کو اس کی تکلیف دینی ایک ایسی چیز کی تکلیف دینی ہے جس کو عالم وجود میں لانے پر انسان قادر نہیں، اسی کو قانونی زبان میں "تکلیف مالایطاق" کہتے ہیں اور تکلیف مالایطاق حکمتِ خداوندی اور مصلحتِ ایزدی کے سراسر خلاف ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ کسی کی محبت کا حکم دینا تکلیف مالایطاق ہے جو حکمتِ خداوندی سے ممکن نہیں۔ خود ارشادِ ربّانی ہے:

لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَہَا۔

اللہ طاقت سے زیادہ کسی نفس پر بوجھ نہیں ڈالتا۔

دیکھا آپ نے! یہ تھی اصل وجہ جس نے علماء مجبور کیا کہ وہ محبت کو ایک ایسے معنی میں استعمال کی راہیں نکالیں جس میں میلانِ طبع کا عنصر شامل ہی نہ ہو۔ لہٰذا انہوں نے محبت کی ۲ دو قسمیں کر دیں۔ ایک تو وہی جو لغتہً و عرفاً محبت ہے اور دوسری وہ جس کو اصطلاحاً محبت کا نام دے دیا گیا ——— عرف و لغت والی محبت کو حُبِّ طبعی، اور اصطلاحی محبت کو حُبِّ عقلی اور حُبِّ اختیاری کہا جانے لگا ———

ان علمائے کرام کی بارگاہ میں فائدہ ۱۲ کے ضمن میں میں نے جو معروضہ پیش کیا ہے اِس مقام پر اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ مزید برآں عرض یہ ہے کہ نظریاتی طور پر حُبِّ عقلی کی کیسی بھی تعبیر کیوں نہ ہو، پیش کی جائے لیکن ذہنی تگ و دو سے الگ ہو کر جب ہم رسُول کریم کے کسی "مُحِبِ عقلی" کی تلاش میں نکلیں گے تو ہم کو خالص مُحِبِ عقلی وہی مل سکے گا جو دَولتِ ایمان سے بہرہ وَر نہ ہوگا۔ ان میں کچھ ہرقل جیسے ہوں گے جو

نبی کی صداقت کا یقین و اذعان حاصل کر لینے کے بعد بھی اپنے کو رسُولِ عربی کی غلامی کے شرف سے مشرف نہ کر سکیں گے اور کچھ ایسے بھی ہو سکتے ہیں جو اپنے کو نفاق کی چادر میں چھُپائے ہوئے نظر آئیں ـــــــــــ

چونکہ بارگاہِ نبوّت میں قلبی جُھکاؤ، تعلق خاطر اور میلانِ طبع کے بغیر ایمان کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا لہذا اس حُبِّ عقلی کا تعلق ایمان سے کیا ہو سکتا ہے۔ جس میں خوب و ناخوب، حق و باطل، صواب و خطا، طیب و خبیث، اور پسندیدہ و ناپسندیدہ کے مابین عقل کے واضح فیصلے تو ملتے ہوں لیکن دل کا جُھکاؤ، طبیعت کا مَیلان اور تعلق خاطر نہ ملتا ہو ـــــــــــ

غور فرمائیے کہ حُبِّ عقلی کی تعریف یہی تو کی جاتی ہے کہ حُبِّ عقلی وہ ہے جو ان تمام امور کو اپنا لینے اور اختیار کر لینے کی موجب ہو، عقل جن کے اپنا لینے کی داعی و متقاضی ہو ـــــــــــ اب سوال یہ ہے کہ آخر یہ اپنائے کون؟ ـــــ عقل یا قلب؟ ـــــــ اگر عقل ہی کا اپنانا حُبِّ عقلی ہے تو اشکال اپنی جگہ پر رہا۔ اس لئے کہ یقین و اذعان کر لینا ہی تو عقل کا اپنانا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ کسی اچھے کی اچھائی کا یقین و اذعان اس پر ایمان کو مستلزم نہیں۔

اور اگر مطلب یہ ہے کہ عقل جس کے اپنا لینے کی متقاضی ہو قلب اس کو اپنا لے، تو اب مجھے بتایا جائے کہ قلبی جُھکاؤ، تعلق خاطر اور میلانِ طبع کے بغیر قلب کے اپنا لینے کی کیا صورت ہے؟ ـــــــ خیال رہے کہ کسی ناپسندیدہ چیز کو طبیعت کا گوارہ کر لینا اور چیز ہے۔ اور ان کو اپنا محبوب نظر بنا لینا اور چیز ـــــــــــ

اس مقام پر دَوا کی مثال عموماً دی گئی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حُبِّ عقلی کی تعریف میں عقل و قلب کا اپنا لینا زیرِ بحث نہیں، بلکہ یہاں خود عقل والے کے اپنا لینے کا ذکر ہے یعنی عقل جس چیز کے اپنا لینے کی دعوت دے عقل والا اُسے اپنالے۔ جیسے عقل دوا استعمال کرنے کی متقاضی ہوئی مریض نے اس کو کراہتِ طبع کے باوجود استعمال کرلیا تو دوا عقلاً محبوب ہوئی اور طبعاً مکروہ۔ لہذا دَوا سے جو محبت ہے وہ خالص حُبِّ عقلی ہے۔

میں فائدہ ۱۲ کے ضمن میں عرض کرچکا ہوں کہ دَوا مریض کو نہ طبعاً محبوب ہے نہ عقلاً۔ مریض کو در اصل صحت سے محبت ہے اور اسی محبوب تک پہونچنے کے لئے وہ ضرورتاً دوائیں استعمال کرتا ہے —— الغرض —— مریض دَوا بر بنائے محبت استعمال نہیں کرتا، بلکہ وہ اُسے بر بنائے ضرورت اپناتا ہے۔ محبوب تک پہونچنے کے لئے جن تکلیفوں اور شدّتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ تکلیفیں بذاتِ خود مقصود و مطلوب نہیں ہوا کرتیں۔ نہ عقلاً مقصود و مطلوب ہوتی ہیں نہ طبعاً۔ ان شدائد کو عقل کی سفارش پر اپنانے والا اُنہیں صرف اس لئے اپناتا ہے تاکہ وہ اپنے محبوب و مطلوب کے وصال و قُرب سے لذت اندوز ہوسکے —— اسی لئے —— اگر بالفرض دوائیں استعمال اور تکالیف و شدائد اختیار کئے بغیر بھی مطلوب و محبوب تک بآسانی پہونچنے کی صورت نکل آئے تو دَواؤں کا استعمال کرنا اور تکالیف کا برداشت کرنا دونوں غیر معقولیت کے خانے میں آجاتے ہیں۔ تو غور فرمائیے کہ جو سرے سے ہی مقصود و مطلوب نہ ہو بلکہ حصولِ مقصود کا صرف ایک ذریعہ ہو، اُس کو

مریض کا محبوب قرار دینا کیسے سمجھ میں آئے ——— المختصر ———
ذاتِ انسانی میں کسی ایسے وصف کا وجود غیر متصور ہے جو عقلِ سلیم کے
تقاضے کے مطابق نبی کریم کے حقوق کی ترجیح کا محرک و موجب ہو
لیکن رسُول کی ذاتِ رسالت کی طرف میلانِ قلب کا مستدعی نہ ہو
عقل سلیم تو خود ہی ذات کی طرف طبع مستقیم کے میلان کی داعی و متقاضی
ہے، ایسی صُورت میں نبی کریم کو ایسا محبوب عقلی بنانا جس کی طرف
طبیعت کا میلان غیر ضروری ہو میری سمجھ سے بالاتر ہے۔
اس لئے کہ طبیعت کے میلان نہ ہونے کی صورت میں صرف عقل
کی استدعا پر کسی کے حقوق کی پُر خلوص ترجیح انسانی فطرت کے خلاف
ہے، اس ترجیح پر بھی آمادہ کرنے والا تعلق خاطر ہی ہوا کرتا ہے۔ تعلق خاطر
کو الگ کر دینے کے بعد عملی دُنیا میں کسی ترجیحی رویّہ کا وجود کیا معنی رکھتا
ہے؟ ——— الحاصل ——— قرآن و حدیث رسُولِ کریم
کی جس محبت کو ضروری قرار دے رہا ہے۔ میرے خیال میں وہ وہی محبت
ہے جس میں ذاتِ رسالت کی طرف طبعی میلان لازمی ہو خواہ وہ طبعی میلان
اندرونی تحریک سے عالمِ وجود میں آئے یا بیرونی تحریک سے۔

اس مسئلے پر اس طرح بھی غور فرمائیے کہ حدیث زیرِ شرح اور
قرآن کریم میں غیر خدا اور غیر رسُول کی محبت کی نہ نفی کی گئی ہے
اور نہ اس محبت سے روکا گیا ہے۔ بلکہ صاف لفظوں میں یہ بات ثابت
کر دی گئی ہے کہ ماں، باپ، بیٹے، بیٹی، بھائی، بہن، شوہر، زوجہ،

اعزّہ و اقارب، اپنی کمائی کے اموال، اپنی تجارت اور پسندیدہ مکانات وغیرہ سے انسانی محبت اس کی فطرت کا تقاضہ ہے، ان امور کی طرف اس کا میلان بالکل طبعی ہے۔ لہذا نہ تو ان چیزوں کی محبت سے اسے روکا جا سکتا ہے اور نہ اس کے طبعی رجحانات کو کچلا جا سکتا ہے ——————

اس کے بعد احبیّت کا مسئلہ شروع فرمایا گیا کہ اگر مذکورہ بالا محبت مغلوب ہے اور اللہ و رسول کی محبت ان جملہ انواع محبت پر غالب تر ہے تب تو سب کچھ ٹھیک ہے لیکن اگر خدانخواستہ اللہ ورسول کی محبت سے ان اشیاء یا ان اشخاص یا ان میں سے کسی کی بھی محبت بڑھ گئی تب معاملہ سخت دشوار ہے اور اس بارے میں جو کچھ حکم اللہ تعالےٰ چاہے گا وہی جاری فرمائے گا —————— اور یہ ظاہر ہے کہ کسی نوع کا کسی دوسری نوع پر غالب ہونا غیر متصوّر و غیر معقول ہے۔ ہر نوع اپنی ہی جیسی نوع پر غالب ہو سکتی ہے ——————

یعنی کسی کی صفت سخاوت پر کسی اور کی صفت سخاوت کا بڑھ جانا، کسی کی شجاعت پر کسی اور کی شجاعت کا غالب ہو جانا اور کسی کی عدالت پر کسی اور کی عدالت کا برتر ہو جانا یہ سب کچھ یقیناً معقول و معروف و متعارف ہے۔ لیکن کسی کی سخاوت کا کسی اور کی شجاعت پر، کسی کی شجاعت کا کسی اور کی سخاوت پر، کسی کی سخاوت کا کسی اور کی عدالت پر، کسی کی عدالت کا کسی اور کی شجاعت پر غالب و برتر ہو جانا، غیر معروف بھی ہے اور نا معقول بھی ——————

یہ ایک ایسی واضح حقیقت ہے جس کو ہر وہ شخص بخوبی سمجھتا ہے

جو بالکلیہ "شیٔ لطیف" سے محروم نہیں ــــــــ ایسی صورت میں عقل کا فیصلہ یہی ہے کہ قرآن و احادیث کی روشنی میں باپ، بیٹے، وغیرہ وغیرہ سے انسان جس نوع کی محبت کرتا ہے، بعینہٖ اُسی نوع کی محبت رسُولِ کریم سے بھی ہونا چاہئیے اور اس شان کی کہ اَوروں کی محبت پر آپ کی محبت غالب و برتر ہو ــــــــ المختصر ــــــــ قرآن و احادیث نے جس نوع کی انسانی محبت باپ، بیٹے وغیرہ کے لئے ثابت کی ہے اس نوع کی محبت پر رسُول کریم کی اسی نوع کی محبت کے غلبہ و برتری کو ایمان کا کمال قرار دیا ہے ــــــــ "ایمان کا کمال" میں نے اس لئے عرض کیا ہے کہ حدیث زیرِ شرح میں "لا یومن احدکم" کی شرح کرتے ہوئے حضرات شارحینِ کرام فرماتے ہیں کہ یہاں ایمان سے مُراد ایمان کامل ہے یعنی "تم میں سے کوئی اُس وقت تک مومن کامل نہیں ہو سکتا" الخ ــــــــ تو جب یہ بات جمہور علمائے کرام کے نزدیک طے ہو چکی ہے کہ ماں باپ وغیرہ کی محبت طبعی اور جبلّی ہے تو اُصولاً اس بات کو بھی طے شدہ ہونا چاہئیے کہ ذاتِ نبی کریم سے اس نوع کی محبت مطلوب ہے اور وہ بھی اس شان کی محبت جو دیگر محبوبین کی محبت پر غالب و برتر ہو ــــــــ الحاصل ــــــــ حُبِّ عقلی اور حُبِّ طبعی کی تقسیم کو مان لینے پر بھی کسی کی طبعی محبت پر کسی دوسرے کی طبعی محبت ہی کی برتری کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے اور حُبِّ طبعی پر حُبِّ طبعی ہی کے غلبہ و برتری کی بات کی جا سکتی ہے۔

رہ گئی حُبِّ عقلی " جس کی حقیقت و ماہیّت حُبِّ طبعی کی

حقیقت و ماہیت سے جداگانہ و مختلف ہے اور جو حُبّ طبعی کی مدّمقابل
اور اس کی قسیم ہے" حُبّ طبعی پر اس کی برتری کا مطالبہ بالکل ایسا ہے
جیسے کوئی کسی کی شجاعت پر کسی دوسرے کی عدالت کے غلبہ و برتری کا
مطالبہ کرے ——— الغرض ——— حدیث زیر شرح میں
رسُول کریم سے جس طرح کی محبت کرنے کا مطالبہ کیا گیا ہے وہ حُبّ طبعی
ہی ہے نہ کہ حُبّ عقلی ۔ نیز ۔ قرآن کریم کی منقولہ آیات میں بھی رسُول کریم
کی حُبّ طبعی ہی کی برتری مطلوب ہے ۔

اَب آئیے ایک دوسری اہم بات کی طرف آپ کی توجہ مبذول
کراؤں ——— خوب ذہن نشین رہے کہ ایک چیز ہے
رسُول کی محبّت ۔ اور ایک چیز ہے رسُول کی احبّیت ۔ گو دونوں طبعی اور
جبلّی سہی، لیکن دونوں میں ایک بنیادی فرق ہے، وہ یہ کہ رسُول کریم
کی محبت کے بغیر ایمان کا وجود تو ہو سکتا ہے مگر ایمان کو کمال نصیب نہیں
ہو سکتا ——— المختصر ——— رسُول کریم کی محبت
نفس ایمان کے لئے اور آپ کی احبّیت کمال کے لئے ضروری و لازمی ہے ۔

اس مقام پر پہونچ کر قدرتی طور پر ایک سوال حاشیۂ خیال سے
سر اُبھارتا ہے، وہ یہ کہ طبعی محبت تو ایک غیر اختیاری چیز ہے ۔ جس سے اَمر
متعلق نہیں ہو سکتا اسلئے کہ تکلیف مالا یطاق حکمتِ خداوندی کو گوارا نہیں ۔
تو قرآن و حدیث کو نبی کریم کی جو محبت مطلوب ہے وہ حُبِّ طبعی کیسے
ہو سکتی ہے ۔ اس سوال کی وضاحت بخوبی کی جا چکی ہے ۔ اب اس سوال کے
حل کے لئے کسی قدر تفصیل کی ضرورت ہے ۔

ایک چیز ہے اپنے دعوئ نبوّت میں کسی نبی کی سچّائی کا علم وعرفان۔ اور دوسری چیز ہے اُس نبی پر ایمان۔ عرفان بھی انسان کے اپنے اختیار کی چیز ہے اور ایمان بھی۔ ان دونوں سے امر کا متعلق ہوسکنا بالکل ظاہر ہے۔ مگر یہ اچھی طرح ذہن نشیں رہے کہ عرفان کے بعد فوراً ہی ایمان کا وجود نہیں ہوجاتا۔ بلکہ عرفان۔ اور ایمان کے درمیان ایک منزل اور بھی ہے اور وہ ہے "طبیعت کا میلان" (بلفظِ دیگر محبت)۔ ایمان، میلان کے بغیر اور میلان، عرفان کے بغیر ناممکن ہے۔ یعنی یہ تو ہوسکتا ہے کہ عرفان ہو، میلان نہ ہو ——— یا ——— میلان ہو، ایمان نہ ہو۔ لیکن یہ ناممکن ہے کہ کسی نبی پر ایمان ہو مگر اس کی طرف طبیعت کا میلان نہ ہو ——— یا ——— اُس کی طرف طبیعت کا میلان تو ہو مگر اُس کے سچے نبی ہونے کا عرفان نہ ہو۔

عرفان وایمان تو اختیاری ہے مگر عرفان کو ایمان سے ملانے والی درمیانی کڑی (یعنی میلان طبع) غیر اختیاری واضطراری ہے جس کا وجود علم وعرفان کے بعد کسی کاوشِ عمل کے بغیر اضطراراً ہوجاتا ہے بشرطیکہ کوئی خارجی یا داخلی رکاوٹ اس کی راہ کا روڑا نہ بن جائے ——— میلان کی راہ کی یہ ساری رکاوٹیں بھی انسان کے اپنے اختیار کی ہیں جن کے تسلّط سے اپنے کو آزاد کرالینا اس کے اپنے بس میں ہے۔

ان حقائق کو ذہن نشیں کر لینے کے بعد یہ بات اظہر من الشمس ہوجاتی ہے کہ بعض اضطراری وغیر اختیاری اعمال ایسے بھی ہیں جو کسی نہ کسی اختیاری عمل کا لازمی اور فطری نتیجہ ہیں، بشرطیکہ ان اضطراری

اعمال کے وجود میں دوسرے موانعات پیش نہ آئیں اور اسی طرح کے ہر غیر اختیاری عمل سے جو کسی اختیاری عمل کا فطری ثمرہ و نتیجہ ہوں امر کا متعلق ہونا تکلیف ما لا یطاق نہیں کیونکہ اس طرح کے اعمال سے امر کے متعلق کرنے کا منشاء یہ ہوتا ہے کہ مامور ان تمام اختیاری اعمال کو انجام دے جن پر عمل در آمد کے نتیجے میں مامور بہ کا وجود لازمی طور پر ہو جائے —— مثلاً —— اگر ہم کسی کو کسی کی محبت کا حکم دیں تو اس کا منشاء یہ ہے کہ ہم اپنے مامور کو مجبور کر رہے ہیں کہ وہ محبوب کا کامل عرفان حاصل کرے اور محبت کے اسباب و موجبات جو اس محبوب کے اندر ہیں شعوری طور پر ان سے کامل وابستگی پیدا کر لے اور پھر ان خارجی یا داخلی عوارض و علل سے اپنے کو دور کر لے جو میلانِ طبع کی راہ میں رکاوٹ بن سکیں۔

اب اس کے آگے اُسے کچھ نہیں کرنا ہے اور اس کچھ نہ کرنے کے باوجود بھی وہ ہونے والی بات (یعنی محبت) ہو کے رہے گی، اب جس سے اپنے کو بچانا اختیار سے باہر ہے —— اختیارات کی تمام منزلوں سے نیک روی کے ساتھ گذر جانے کے بعد یہ خاص نوع کا اضطراری عمل وجود میں آ کر رہے گا —— لھذا —— اس طرح کے اضطراری عمل سے اَمر کا متعلق ہونا نہ تکلیف ما لا یطاق ہے اور نہ حکمت خداوندی کے خلاف —— اب آیئے امثال و نظائر کی روشنی میں بھی دیکھتے چلیں کہ اس طرح کے اضطراری عمل سے امر کا متعلق ہونا معروف و متعارف ہے۔

مثال ۱: قوتِ سامعہ کی موجودگی میں اپنے گرد و پیش کی آواز کا سننا انسان کا ایک غیر اختیاری عمل ہے۔ وہ چاہے یا نہ چاہے مگر

اُسے سُننا ہی پڑے گا۔ مگر چونکہ اسے اس بات کا پورا اختیار ہے کہ وہ کسی خاص چیز کی طرف کامل انہماک کے ساتھ ایسا متوجہ ہو جائے کہ اپنے قریب کی بھی آواز نہ سُن سکے۔ اور یہ بھی اختیار ہے کہ یہ خصوصی انہماک اپنے اُوپر نہ طاری کرے اور ہر طرف کی سُنتا رہے۔ اس لئے اَب اُسے سُننے کا حکم دینا تحصیل حاصل ہو کر تکلیف مالا یطاق نہیں بلکہ اس حکم کا منشاء یہ ہے کہ سُننے والا ان تمام موانعات کو دُور کر دے یا دُور رکھے جو سُننے کی راہ میں رکاوٹ بنیں۔

مثال ۲: قوتِ باصرہ کی موجودگی اور آنکھ کھُلی رہنے کی صورت میں تا حدِّ نظر انسان کا دیکھنا ایک غیر اختیاری عمل ہے چاہے یا نہ چاہے اُسے دیکھنا ہی پڑے گا۔ مگر چونکہ اُسے اس بات کا پورا اختیار ہے کہ آنکھوں کو بند کر لے یا آنکھوں کے سامنے کوئی حجاب لا کر رکھ دے اس لئے اَب اسے دیکھنے کا بھی حکم دیا جائے گا جس کا منشاء یہ ہے کہ دیکھنے والا ان تمام رُکاوٹوں سے اپنے کو دُور کر دے یا دُور رکھے جو دیکھنے کی راہ میں مانع ہوں۔

مثال ۳: قوتِ شامّہ کی سلامتی کی صورت میں اپنے ہر چہار طرف پھیلی ہوئی مہک کا سُونگھنا انسان کے لئے ایک غیر اختیاری عمل ہے، چاہے یا نہ چاہے اُسے سُونگھنا ہی پڑے گا، مگر چونکہ اسے اس بات کا پورا اختیار ہے کہ وہ اپنی ناک بند کر لے ——— یا ——— اس ماحول ہی سے دُور ہو جائے ——— یا ——— گردوپیش کی بُو کے احساس کو ختم کرنے کے لئے کوئی اس سے بھی زیادہ مہک والی چیز کو اپنی ناک کے قریب کر لے اس لئے اب اُسے اپنے چہار طرف پھیلی ہوئی مہک کے

سُونگھنے کا حکم دینا کوئی مضائقہ نہیں رکھتا۔ اس حکم کا منشاء صرف یہی ہوگا کہ انسان ان تمام موانعات سے دُور ہو جائے ——— یا ——— دُور رہے جو اس خاص ماحول میں قوتِ شامّہ کے فطری اور غیر اختیاری عمل کے وجود پر اثر انداز ہوں۔

مثال نمبر ۴ ہم نے حکم دیا کہ فلاں چیز کو لے جاؤ اور دریا میں بہا دو۔ حالانکہ لے جانے والے کے اختیار میں صرف یہی ہے کہ وہ اُس چیز کو دریا کے بہتے ہوئے دھارے تک پہونچا دے۔ اس کے بعد بہا لے جانا یہ اس کے اختیار سے باہر ہے۔ دھارے تک پہونچانے والا چاہے یا نہ چاہے بہرصورت وہ بہنے والی چیز بہہ کر رہے گی بشرطیکہ راہ میں کوئی ایسی رکاوٹ نہ آجائے جو دریا کے بہاؤ پر غالب ہو ——— بلکہ ——— بہا لے جانا خود دریا کے اختیار سے باہر ہے کہ وہ چاہے تو اسے بہا لے جائے اور نہ چاہے تو نہ بہائے، بہا لے جانا خود دریا کا ایک غیر اختیاری عمل ہے ——— تو ایسی صورت میں ہمارے مذکورہ بالا حکم کا منشاء یہی ہوگا کہ فلاں چیز کو وہاں تک پہونچا دو جہاں سے کوئی خاص رکاوٹ نہ ہونے کی صورت میں اس کا بہہ جانا ضروری اور لازمی ہو ———

ان ہی چند مثالوں پر غور کر لینے سے یہ بات کھُل کر سامنے آجاتی ہے کہ بعض اعمال ایسے بھی ہیں جو غیر اختیاری ہونے کے باوجود بھی مامور بہ ہوسکتے ہیں بلکہ صرف ہوسکتے ہی نہیں۔ بلکہ امر کا ان سے متعلق ہونا معروف ومتعارف ہے۔ اس طرح کے اعمال کا حکم دینا تکلیف مالایطاق بھی نہیں ———

ہاں ——— اگر کوئی کسی ایسے سے محبت کرنے کا حکم دے جس میں محبت

کے اسباب و موجبات اور داعیات و محرکات بالکلیہ مفقود ہوں اور قلب کو اپنی طرف جھکانے والی کوئی چیز اُس کی ذات میں نہ ہو۔ یقیناً ایسوں کی محبت کا حکم طبیعت پر بے جا دباؤ اور جبر بلکہ تکلیف مالایطاق ہے حکمتِ خداوندی جسے گوارا نہیں کرسکتی جیسا کہ ارشادِ ربّانی ہے :

لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا۔

اللہ طاقت سے زیادہ کسی نفس پر بوجھ نہیں ڈالتا۔

لیکن وہ محبوب جس کے ظاہر و باطن میں محبت اور احبیّت کے اسباب و موجبات اور داعیات و محرکات کے بے شمار گُل بُوٹے کھِلے ہوں اور عالم یہ ہو ؎

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل میکشد کہ جا ایں جاست

واجمل منك لم ترقط عینی
واکمل منك لم تلد النساء
خلقت مبرءًا عن کل عیب
کانك قد خلقت کما تشاء

(حضرت حسان رضی اللہ عنہ)

آپ سے بڑھ کر حسین و جمیل میری آنکھوں نے نہیں دیکھا اور آپ سے زیادہ کامل کسی عورت نے جنا ہی نہیں آپ ہر عیب سے پاک و صاف پیدا کیے گئے۔ گویا کہ آپ کی تخلیق آپ کی مرضی کے مطابق ہوئی۔

مرقات، زرقانی اور شفا وغیرہ کی صاف اور بے غبار عبارتوں سے جس رسُول کا مختصر تعارف حدیث زیرِ شرح کے ضمن میں کرا چکا ہوں، ایسے محبوب کی محبت اور احبیّت کا حکم دینا تکلیف مالایطاق نہیں، بلکہ عقل و شعور کے نزدیک ربِّ اکرم کا احسانِ عظیم ہے۔

مجمع البحار میں اِس بات کی وضاحت کے بعد کہ جہاں جہاں رسُولِ کریم کی محبّت کا حکم دیا گیا ہے، وہاں محبّت سے حُبِّ عقلی مُراد ہے نہ کہ حُبِّ طبعی۔ اور پھر اس کو مریض اور دوا کی مثال سے سمجھا کر اور وجہِ صلاحِ دارین اور مخلوقات پر شفیق تر ہونے کے سبب نبی کریم علیہ التحیۃ والتسلیم کو حُبِّ عقلی کا مرکز قرار دے کر یہ بھی تحریر ہے:

وھو ادنیٰ درجات الایمان وکمالہ ان یکون طبعہ تابعا لعقلہ فی حبّہ۔

(رسُول کریم کی ذات سے عقلی محبت) ایمان کا ادنیٰ اور کمتر درجہ ہے۔ ایمان کا کمال یہ ہے کہ رسُول کریم کی محبت میں طبیعت عقل کی تابع ہو۔

مجمع البحار میں "احب الیہ مما سواھما" کی شرح کرتے ہوئے یہ سب کچھ فرمایا گیا ہے، جس میں خدا و رسُول دونوں کی محبت زیرِ بحث ہے۔ میں نے صرف رسُول کی محبت کا ذِکر اس لئے کیا ہے کہ جس حدیث کی شرح مَیں کر رہا ہوں اس میں صرف رسُول کریم ہی کی محبت زیرِ بحث ہے۔ اور یوں بھی خدا و رسُول کی محبت کچھ دو تو ہے نہیں بلکہ ایک کی محبت دوسرے کی محبت کو مستلزم ہے۔

مجمع البحار کی مذکورہ عبارت واضح کر رہی ہے کہ حُبِّ عقلی ایمان کا کمترین درجہ ہے، ایمان کے کمال کے لئے رسُول کریم کی طرف طبیعت کا میلان، ان میلانات سے شدید تر ہونا چاہئے جو باپ، بیٹے وغیرہ کی طرف ہیں، ورنہ ایمان تو ہوگا، لیکن ایمان کو کمال نصیب نہ ہوگا۔ اور اس میں

کوئی شک نہیں ہے کہ ایمان کے کمال کی انتہا یہی ہے کہ چاہنے والا رسُول کو اتنا چاہے کہ کسی کی چاہت آپ کی چاہت کے برابر بھی نہ ہو سکے، چہ جائیکہ بڑھ جائے ——— اب دیکھنا یہ ہے کہ حدیث زیرِ شرح میں لَا یُؤمِنُ سے کیا مُراد ہے ——— مرقات میں ہے:

لا یومن احدکم .... ای ایمانًا کاملًا۔

تم میں سے کوئی مومن یعنی ایمان کامل والا نہیں ہو سکتا۔

فتح الباری میں ہے:

(لا یومن) ای ایمانًا کاملًا۔

لایومن میں ایمان سے مُراد ایمان کامل ہے۔

اشعۃ اللمعات میں شیخ محقق نے بھی یہی فرمایا ہے ———

ان حوالہ جات کی روشنی میں جب یہ طے ہو گیا کہ حدیث زیرِ شرح میں جو ایمان زیرِ بحث ہے وہ ایمانِ کامل ہے۔ پھر تو اس بات میں کوئی اختلاف ہی نہ ہونا چاہئے کہ حدیث مذکور میں اجبیت سے مُراد طبعی اجبیت ہی ہے، اس لئے کہ باپ، بیٹے وغیرہ کی طرف طبعی جُھکاؤ سے زیادہ جب تک رسُولِ کریم کی طرف طبعی میلان نہ ہو گا اُس وقت تک ایمان مرتبۂ کمال تک نہیں پہنچ سکتا ——— الغرض ——— حُبِّ عقلی اور حُبِّ طبعی کی تقسیم کو قبول کر لینے کے بعد بھی اس بات کی ضرورت نہیں کہ حدیث زیرِ شرح میں ذکر کردہ اجبیّت کو حُبِّ عقلی ہی پر محمول کیا جائے۔ بلکہ لَا یُؤمِن میں ایمان سے ایمان کامل مُراد لینے کی صورت میں لازم ہو جاتا ہے مذکورہ اجبیّت سے طبعی اجبیّت ہی مُراد لی جائے اس لئے کہ عقلی اجبیّت کا جو معنی بیان

کیا جاتا ہے اس کا حاصل یہی ہے کہ " آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق کی ادائیگی کو دوسروں کے حقوق کی ادائیگی پر ترجیح دی جائے"۔ اور ظاہر ہے کہ مذکورہ عملِ ترجیح کا عقیدہ اس قدر ضروری ہے کہ اس کے بغیر ایمان کا وجود ہی نہیں ہو سکتا۔ چہ جائیکہ ایمان کامل ہو۔ لہٰذا عقیدۂ ترجیح کو نفسِ ایمان کے وجود کے لئے تو ضروری بتایا جا سکتا ہے لیکن صرف مذکورہ عقیدے سے ایمان کو کمال نہیں ہو سکتا ——— اب اگر عقیدہ کے ساتھ ساتھ عملی زندگی بھی مذکورہ بالا ترجیح کا ثبوت دینے لگے تو پھر نفسِ ایمان مرتبۂ کمال کیطرف رواں دواں نظر آئے گا اور مختلف مدارجِ کمال کی انتہا کیطرف انسان سرگرمِ سفر ہوگا۔ مگر یہ بخوبی ذہن نشیں رہے کہ کسی کے ایمان کو کسی طرح کا کمال میسّر نہیں آسکتا جب تک اس عقیدہ و عمل کے ہر ہر گوشے پر طبعی میلانات کی کارفرمائی نہ ہو۔ سچ کہا ہے کہنے والے نے ——— کہ

——— محبت ہی سے انابت الی اللہ کی صفت پیدا ہوتی ہے اور محبت ہی خوف و رجا کا معدن ہے۔ محبت ہی ہے جو انسان کو کبھی مقامِ رضا اور کبھی مقامِ شکر پر متمکن کر دیتی ہے ——— صبر بھی وہی صبر ہے، جس کی بناء محبت پر ہو۔ ورنہ اس کا نام بیچارگی ہوگا ——— زہد بھی وہی زہد ہے جس کا منشاء محبت ہو۔ ورنہ اس کا نام عدمِ دسترس ہوگا ——— حیا بھی وہی حیا ہے جس کی ولادت محبت سے ہو، جو ادب و تعظیم کی ہوا میں پلی ہو۔ ورنہ اس کا نام انفعالِ طبع ہوگا ——— فقر بھی وہی فقر ہے جو مُحِب کو بجانبِ محبوب ہوا اور دل اپنی تمام تر قوت کے ساتھ محبوب کے جُود و نوال کی جانب منجذب ہو جائے۔ ورنہ اس کا نام

تنگ دستی ہوگا ——— الغرض ——— محبّت ہی قوت القلوب ہے، محبت ہی غذاء الارواح ہے، محبت ہی قرۃ العیون ہے، محبت ہی حیوٰۃ الابدان ہے، محبت ہی دل کی زندگی ہے، محبت ہی زندگی کی کامیابی ہے، محبت ہی کامیابی کو بقاء و دوام کا تاج پہناتی ہے، محبت ہی بقاء کو تختِ ارتقاء پر بٹھلاتی ہے ——— محبت کا کمال دیکھنا ہو تو صحیح بخاری کی اِس حدیث پر غور فرمائیے:

عن عبد اللّٰہ بن ھشام قال کنّا مع النّبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم وھو اٰخذ بید عمر ابن الخطاب فقال لہ عمر یا رسول اللّٰہ لانت احب الی من کل شیءٍ الا نفسی فقال النّبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم لا والّذی نفسی بیدہ حتیٰ اکون احبّ الیک من نفسک فقال لہ عمر فانہ الاٰن واللّٰہ لانت احب الیّ من نفسی فقال النّبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم لہ الاٰن یا عمر ہ

(بخاری کتاب الایمان والنذور)

حضرت عبد اللہ ابن ہشام فرماتے ہیں کہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے اور آپ حضرت عمر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے تھے اسی اثناء میں حضرت عمر نے آپ سے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسُول! آپ میری جان کے سوا مجھے ہر چیز سے زیادہ عزیز ہیں۔ اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، نہیں قسم ہے اُس ذات کی

جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے۔ یہاں تک کہ ہو جاؤں
میں تجھے تیری جان سے بھی زیادہ عزیز۔ پھر حضرت عمر نے آپ سے
عرض کیا پس بے شک وہی حال ہے، اس وقت قسم خدا کی
یقیناً آپ مجھے میری جان سے بھی زیادہ عزیز ہیں تو نبی صلی اللہ
علیہ وسلم نے فرمایا ہاں اَب یا عمر۔

مرقات میں بخاری کے حوالے سے جو روایت نقل کی ہے اس کا آخری حصّہ
یوں ہے :

فقال الآن یا عمر تم ایمانك۔ رواہ البخاری
(مرقات)

تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے عمر! اَب جا کے تمہارا ایمان
مکمل ہو گیا۔

مذکورہ روایت میں "لا والذی نفسی بیدہ" کی شرح زرقانی نے
یوں کی ہے :

(لا) یکمل ایمانك (والذی نفسی بیدہ) ای
بقدرته۔ (زرقانی)

قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے
تمہارا ایمان کامل نہیں ہو سکتا یہاں تک کہ الخ۔

ایک روایت وہ ہے جو پہلے ہی شفا شریف کے حوالے سے ذکر کی جا چکی
ہے۔ جس میں لب ہائے نبوت سے نکلے ہوئے کلمات یہ ہیں :

لن یومن احدکم حتیٰ اکون احبّ الیہ من نفسہٖ

تم میں سے کوئی مومن کامل ہو ہی نہیں سکتا۔ یہاں تک کہ اُسے میں اُس کی جان سے بھی زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔

سرکارِ نبوّت کے ارشاد "لا والذی نفسی بیدہ حتیٰ اکون الخ" کا بعض بزرگوں کے نزدیک یہ مطلب ہے:

(لا تصدق فی حبی حتی تؤثر رضائی علی ھواك و ان کان فیہ الھلاك) بالجھاد او اماتۃ النفس ٥

(مواہب وزرقانی)

تم میری محبت میں سچّے نہ ہوں گے جب تک میری رضا کو اپنی خواہش پر ترجیح نہ دو۔ اگرچہ اس میں بذریعہ جہاد یا نفس کی قربانی کے ذریعہ ہلاکت ہی کیوں نہ ہو۔

محقق علی الاطلاق شیخ عبدالحق محدّث دہلوی قدس سرّہٗ نے اشعۃ اللمعات میں جو روایت بیان فرمائی ہے وہ خاصی مفصّل ہے ـــ حدیث زیرِ شرح کے تحت جواہر پارے میں اس کو نقل کر چکا ہوں۔ تمام روایتوں کے مضامین کو اگر ایک مضمون کی شکل دی جائے اور شارحین نے حدیث کے بعض فقروں کی جو توضیح کی ہے اس کو بھی شامل مضمون کر لیا جائے تو یہ مفصل بیان سامنے آتا ہے:

"ایک روز بہت سے صحابہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے اور آپ حضرت عمر کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر سے

دریافت کیا کہ اے عمر تمہارا کیا حال ہے صرف مجھی کو دوست رکھتے ہو یا میرے سوا کو بھی ؟ حضرت عمر نے عرض کی کہ محبت مشترک ہے، آپ کو بھی محبوب رکھتا ہوں اور اپنی جان، اپنے بچوں اور مال و دولت کو بھی۔ یہ سُن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر کے سینے پر ہاتھ رکھا اور ان کے دل پر ایک خاص توجہ ڈال کر تصرف فرمایا اور پھر دریافت فرمایا اب کیا حال ہے۔ اپنے کو کیسا پا رہے ہو؟ حضرت عمر نے جواباً عرض کیا کہ میرے دل سے اہل و مال کی محبت تو ساقط ہو گئی مگر جان کی محبت ابھی باقی ہے اور بے شک آپ میرے نزدیک میرے دونوں پہلوؤں کے درمیان رہنے والی میری جان کے سوا ہر چیز سے زیادہ عزیز ہیں۔ اس پر حضور نے فرمایا قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے تمہارا ایمان اُس وقت تک کامل نہیں ہو سکتا یہاں تک کہ میں تجھے تیری جان سے بھی زیادہ عزیز نہ ہو جاؤں۔ (یا حضور نے یہ فرمایا کہ) تم میں سے کوئی اُس وقت تک مومن (یعنی مومن کامل) ہو ہی نہیں سکتا جب تک کہ وہ مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ محبوب نہ بنا لے۔ پھر آپ نے دوسری بار حضرت عمر کے سینے پر ہاتھ رکھا اور ارشاد فرمایا اب کیسے ہو؟ حضرت عمر نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ پر کتاب نازل فرمائی اب میرے

دل میں کسی اور کی محبت نہیں رہ گئی اب صرف آپ کی محبت ہے جو میرے دل کے ہر ہر گوشے میں سمائی ہوئی ہے، یقیناً آپ مجھے میری جان سے بھی زیادہ محبوب ہیں۔ اُس وقت حضور نے فرمایا اے عمر اب جا کے تمہارا ایمان مکمل ہوگیا۔"

روایتوں کے اختلاف اور مذکورہ اجمال و تفصیل کی وجہ سلسلۂ راویان میں سے کسی راوی کا سہو و نسیان بھی ہوسکتا ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ راویوں کے اسلوبِ بیان کا فرق ہو۔ کسی نے مفصل روایت بیان کی اور کسی نے مجمل۔ جس نے جس وقت جو بیان کرنا مناسب سمجھا اُسی قدر بیان کر دیا اور یہ اصولی بات ہے کہ:

من حفظ حجۃ علی من لم یحفظ ومن ذکرہ مقدم علی من سکت عنہ لان معہ زیادۃ علم۔

(مرقات)

جس نے یاد رکھا وہ حجت ہے اُس پر جو نہ یاد رکھ سکا اور جس نے ذکر کیا وہ مقدم ہے اُس پر جو خاموش رہ گیا اس لئے کہ حافظ اور ذاکر کے ساتھ علم کی زیادتی ہے (یعنی حفظ و ذکر حافظ و ذاکر کی فراوانی علم کی دلیل ہے)۔

مذکورہ بالا پوری روایت کے ایک ایک جملے کو بغور دیکھ لینے کے بعد اس بات میں شبہ نہیں رہ جاتا کہ اس روایت میں محبّت و احبّیت کی پوری داستان طبعی محبّت و احبّیت ہی سے متعلق ہے ——— سرکارِ نبوّت حضرت عمر سے سوال و جواب کر کے اُن کو اور اُن کے سوا دیگر حاضرین کو یہی

سمجھانا چاہتے تھے کہ جب تک میری طرف طبیعت کا میلان جان اور اہل و مال کی طرف طبعی میلانات پر غالب نہ ہوگا، اُس وقت تک کما حقہٗ کسی کا ایمان کامل نہ ہوگا۔

پُوری روایت کو سامنے رکھ لینے کے بعد اس خیال کی بھی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ حضرت عمر نے حضور کے سوال کو سمجھے بغیر جواب دیدیا، حضور نے تو حُبِّ عقلی سے متعلق سوال کیا تھا اور حضرت عمر نے حُبِّ طبعی سمجھ کر جواب دیا ——— اس لئے کہ روایت کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ حضرت عمر نے خوب سمجھ کر جواب دیا ہے اور جواب دینے میں کامل سچائی سے کام لیا ہے۔ اپنی جان اور اہل و مال کی محبّت سے رسُول کریم کی محبّت کی طرف ان کا سفر بتدریج ہوا۔ نیز ان کے اس سفر میں نبی کریم کے دستِ شفقت اور تصرفِ خاص کی مخصوص کرم فرمائی شامل ہے۔

غور فرمائیے وہ فاروق اعظم جن کے علم و عمل، دانائی و فراست، اخلاص و للّٰہیت، محاسن و محامد اور فضائل و مناقب کے بیان میں زبانِ رسالت مآب گوہر افشاں ہو، کتُب احادیث کے صفحات جس پر شاہد عدل ہیں، اس فاروق اعظم کا مزاج شناس رسالت دماغ سرکار رسالت کے منشاءِ کلام کو نہ سمجھ سکے اور غیر واجبی جواب دیدے، بھلا یہ کیسے سمجھ میں آئے۔ یقیناً حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا جواب سوال کے بالکل مطابق تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے طبعی میلان ہی کے بارے میں دریافت کیا تھا اور حضرت عمر نے اسی سے متعلق جواب دیا ——— اور یہ بھی تو سوچئے کہ حضرت عمر سے حُبِّ عقلی یا عقلی محبّت سے متعلق سوال کی ضرورت کیا تھی ———

یا ـــــــ خود حضرت عمر کو کیا ضرورت تھی کہ عقلی احبّیت کی داستان چھیڑتے اس لئے کہ رسُول کریم کی احبّیت کی تشریح میں آپ کے حقوق کی ادائیگی کی ترجیح ہی کا تو ذکر کیا جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس ترجیح کا عقیدہ تو نفس ایمان کے لئے ضروری ہے توپھر اس عقیدے سے حضرت عمر کی محرومی کا کیا سوال ہے اور جب یہ عقیدۂ ترجیح حضرت عمر کا بھی عقیدہ رہا توپھر اُن سے عمل کا اس عقیدے کے برعکس ہونا چہ معنی دارد؟ اور اُن کی عملی زندگی کو اُن کے عقیدہ کے برخلاف ثابت کرنا کہاں کی سعادت مندی ہے؟ ـــــــ

المختصر ـــــــ نبی کے حقوق کی ترجیح والی احبّیت حضرت عمر کو ایمان لاتے ہی حاصل ہوگئی تھی جو زندگی کے کسی آن میں بھی جُدا نہ ہوسکی۔ اس طرح کی احبّیت سے رسُول کریم کے اصحابؓ کی تہی دامنی کا سوال ہی کیا تھا جنہوں نے اپنی ساری کائنات لُٹا کر رسُول کریم کی سچّی غلامی اختیار کرلی تھی اور جن کے نزدیک رسُول کریم کی رضا حاصل کرنے کے لئے مصائب و آلام کے پہاڑ سے ٹکرا جانا کوئی قابلِ ذکر بات ہی نہیں رہ گئی تھی۔ لہٰذا یقین و اذعان کا فیصلہ یہی ہے کہ رسُول کریم کی خاص توجہ سے حضرت عمر جس احبّیت کے مقام بلند تک پہونچ گئے وہ وہی طبعی احبّیت تھی جو درحقیقت حقیقی محبّت (میلانِ طبع کا مرتبۂ کمال) ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ:

اوصله الله تعالیٰ الی مقام الاتم ببرکة
توجهه علیه الصّلوٰة والسّلام فطبع فی قلبه
حبه حتی صار کانه حیاته ولبه۔

(مرقات)

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی توجہ کی برکت سے حضرت عمرؓ کو محبت کے کامل واکمل مقام تک پہونچا دیا اور ان کے قلب میں آپ کی محبت کی گہری چھاپ لگادی یہاں تک کہ آپ کی محبت گویا ان کی زندگی ان کے جسم کا مغز ہوگئی۔

(۸) — قال القرطبی وکل من صح ایمانہ بہ علیہ الصلوٰۃ والسلام لا یخلو من وجدان شیء من تلک المحبۃ الراجحۃ وان استغرق بالشھوات و حجب بالغفلات فی اکثر الاوقات بدلیل انا نری اکثرھم اذا ذکر صلی اللہ علیہ وسلم اشتاق الی رویتہ ومآثرھا علی اھلہ ومالہ وولدہ ووالدہ واوقع نفسہ فی المھالک والمخاوف مع وجدانہ من نفسہ الطمأنینۃ بذلک ووجدانا لا تردد فیہ وشاھد ذلک فی الخارج ایثار کثیرین لزیارۃ قبرہ الشریف و رویۃ مواضع آثارہ علی جمیع ماذکرلما وقرنی قلوبھم من محبتہ غیر ان قلوبھم لما ترالت غفلاتھا وکثرت شھواتھا کانت فی اکثر اوقاتھا یلھوھا ذاھلۃ عما ینفعھا ومع ذلک ھم فی برکۃ ذلک النوع من المحبۃ فیرجی لھم

كل خير انشاء الله تعالىٰ ولاشك ان حظ الصحابه رضی الله عنهم من هذا المعنى اتم لانه ثمرة المعرفة وهم بقدره ومنزلته أعلم وقال النووى فى الحديث تلميح الى صفة النفس المطمئنة والامّارة فمن رجح جانب نفسه المطمئنة كان حبه عليه الصّلوٰة والسّلام راجحا ومن رجح جانب نفسه الامّارة كان بالعكس ا ـ ھ

(مرقات)

"علامہ قرطبی فرماتے ہیں کہ ہر مومن صحیح الایمان حضور علیہ السّلام کی محبتِ راجحہ سے کچھ نہ کچھ حصہ ضرور پاتا ہے اگرچہ وہ اپنے اکثر اوقات میں خواہشات میں مستغرق اور غفلتوں میں پوشیدہ ہو اس کی دلیل ہمارا مشاہدہ ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر مسلمان جب اس کے سامنے رسُول پاک کا ذکر کیا جاتا ہے تو وہ آپ کے دیدار کے مشتاق ہو جاتے ہیں اور آپ کے دیدار پاک کو اپنے اہل و مال اور باپ بیٹوں پر ترجیح دیتے ہیں اور اسکے لئے خوف ہلاکت کی جگہوں میں اپنے کو ڈال دیتے ہیں، باایں ہمہ وہ اپنے اندر کوئی اضطراب نہیں پاتے بلکہ اپنے اس فعل سے انہیں آرام و سکون ملتا ہے اور کثیر در کثیر مسلمانوں کا حضور علیہ السّلام کی قبر شریف اور آپ کے آثار پاک کی زیارت کو

ان تمام مذکورہ یعنی اہل ومال، باپ بیٹے پر ترجیح دینا خارج میں اس پر گواہ ہے یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ آپ کی محبت کا کچھ نہ کچھ حصہ ان کے قلوب میں جاگزیں ہو چکا ہے۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ جب ان کے قلوب پر غفلتیں مُسلّط ہو جائیں اور خواہشات کی کثرت ہو جائے تو وہ اپنے اکثر اوقات میں اپنے لہو ولعب کے سبب ان اُمور سے غافل ہو جائیں جو ان کے لئے نفع بخش ہیں ——— بااین ہمہ ——— محبت کی اس خاص نوع کی برکت سے یہ بھی محروم نہیں اور جب ایسا ہے تو ان کے لئے کل خیر (کامل محبت) کی بھی امید کی جاتی ہے۔ اگر اللہ تعالٰی چاہے گا تو انہیں یہ دولت بھی مل جائے گی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ رسُولِ کریم کی محبت سے صحابہ کا حصّہ کامل ومکمل تھا کیونکہ محبت معرفت کا نتیجہ ہے اور صحابہ رسُول کریم کی قدر و منزلت کو زیادہ جاننے والے تھے۔

امام نووی فرماتے ہیں:

کہ حدیث میں نفس مطمئنّہ اور نفس امّارہ کی صفتوں کی طرف اشارہ ہے تو جو اپنے نفس مطمئنّہ کی طرف جُھکا، اُس کے دل میں آپ کی محبت راجح وغالب ہو گی۔ اور جو اپنے نفس امّارہ کی طرف مائل ہوا اس کا معاملہ اس کے برعکس ہو گا۔

علّامہ قرطبی اور علّامہ نووی کے حوالہ سے مذکورہ باتوں کو مختصراً

علامہ قسطلانی نے بھی فتح الباری میں نقل فرمایا ہے ——— ان عبارتوں سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ رسُول کریم کی طرف جس مسلمان سے دارین کی صلاح و فلاح میسّر آتی ہے وہ میلانِ طبع ہی ہے۔ اور یہی ہے وہ محبت جس کو راجح و غالب کر دینا مطلوب ہے۔

(۹) ——— محبت و میلانِ طبع کی بہت سی قسمیں ہیں :

الف:۔ محبتِ الوہیّت والٰہیت ۔ یہ وہ محبت ہے جو عبد کو اپنے معبود سے، مخلوق کو اپنے خالق سے، مرزوق کو اپنے رازق سے، مربوب کو اپنے رب سے، مملوکِ حقیقی کو اپنے مالکِ حقیقی سے ہوتی ہے۔ کسی غیر خدا سے ایسی محبت کھلا ہوا شرک ہے۔ تعالیٰ وحدہٗ لاشریک ہی اس محبت کے لائق ہے۔ اس محبت کا تقاضہ یہ ہے کہ چاہنے والا خدا کی ذات وصفات میں کسی غیر کو شریک نہ کرے نہ عقیدۃً نہ عملاً۔ اور اس کی بارگاہ میں کمال فروتنی کے ساتھ پیش آتا رہے اور اس کی عبادت و اطاعت سے غافل نہ رہے ——— ارشادِ قرآنی ہے :

والذین آمنوا اشد حبا للّٰہ ۔

وہ لوگ جو ایمان لا چکے اللہ کی محبت میں بہت ہی سخت و شدید و اشد ہیں۔

اس آیتِ کریمہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ کی محبت میں شدت ایمان کا نتیجہ ہے اس لئے کہ اس میں صاف لفظوں میں ایمان لا چکنے کے بعد ایمان لانے والوں کو خدا کی محبت میں شدید بتایا گیا ہے ——— اللہ کی

محبّت کو اُس کے ماسوا ہر ایک کی نسبت پر ترجیح دینے کا اشارہ اس ارشادِ نبوی سے بھی ملتا ہے جسے ترمذی و حاکم نے حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے اور اس کو صحیح قرار دیا ہے وہ کلام بلاغت نظام یہ ہے :

احبّوا اللّٰہ لما یغذوکم بہ من نعمہ و احبّونی لحبّ اللّٰہ و احبوا اھل بیتی لحبّی ○

(زرقانی)

اللہ سے محبت کرو۔ اُس کی اُن نعمتوں کے سبب جن سے وہ تمہیں نوازتا رہتا ہے اور مجھ سے محبت کرو اللہ کی محبت کے سبب۔ اور میرے اہلبیت سے محبت کرو میری محبّت کے سبب۔

ب:۔ محبت بسببِ نبوّت و رسالت ۔ یہ وہ محبّت ہے جو اُمّتی کو اپنے نبی سے ہوتی ہے ۔ اس محبّت کا تقاضہ یہ ہے کہ چاہنے والا اپنے نبی کی کامل اطاعت کرتا رہے اور اُس نبی کی تعظیم و توقیر اور پُرخلوص وفاداری سے کبھی غافل نہ ہو ——— علامہ قاضی عیاض قدس سرّہٗ کے کلام سے اور میری سابقہ تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ رسُول کی طرف میلانِ طبع یعنی آپ کی محبت نفسِ ایمان کے لئے شرط ہے ——— رہ گئی آپ کی احبّیت یعنی محبتِ راجحہ تو وہ ایمان کے کمال کے لئے ضروری ہے ———

فتح الباری میں ہے :

فی کلام القاضی عیاض ان ذالک شرط فی صحۃ الایمان لانہ حمل المحبۃ علی معنی التعظیم والاجلال وتعقبہ صاحب المفھم بان ذالک لیس مرادًا ھنا

لان اعتقاد الاعظمیة لیس مستلزما للمحبة اذ قد یجد الانسان اعظام شیٔ مع خلوہ من المحبة۔ (فتح الباری، مواہب)

قاضی عیاض کے کلام میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ رسول کی محبت ایمان کی صحت کے لئے شرط ہے کیونکہ انہوں نے محبت کو تعظیم و اجلال کے معنی میں محمول کیا ہے اس پر صاحب مفہم نے گرفت کی ہے کہ یہ یہاں مُراد نہیں اس لئے کہ کسی کے عظیم تر ہونے کا اعتقاد اس کی محبت کو مستلزم نہیں اس لئے کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان کسی شئے کی عظمت و برتری کا اعتراف رکھتے ہوئے اس کی محبت سے خالی ہوتا ہے۔

صاحب مفہم علامہ ابُوالعباس احمد ابن محمد قرطبی کی مذکورہ گرفت کو مضبوط کرنے کے لئے اس روایت کا بھی سہارا لیا گیا ہے جس کی مفصل تشریح ہو چکی ہے اور جس میں فاروق اعظم کی احبّیت کا بیان ہے۔ اس روایت کی روشنی میں مذکورہ موقف کی تائید اس طرح حاصل کی گئی ہے کہ اگر محبت عظمت کے ہم معنی ہوتی ——— یا ——— اعظمیّت و احبّیت کا ایک ہی مفہوم ہوتا تو پھر سیّدنا فاروق اعظم کو رسُول کریم اپنی احبّیت کی تعلیم نہ فرماتے اس لئے کہ رسُول کریم کی عظمت و اعظمیّت کے اعتقاد سے فاروق اعظم کی ایمانی زندگی کا کوئی لمحہ خالی نہ تھا اور ایسے بھی رسُول کریم کی عظمت کے اعتقاد کے بغیر کوئی مومن کیسے ہوسکتا ہے؟ تو ظاہر ہوگیا کہ محبت اور ہے، عظمت اور ہے۔ عظمت کا اعتراف بغیر محبت کے بھی ہوسکتا ہے

اس لئے کہ عقلاً یہ ہو سکتا ہے کہ ہم کسی کو عظمت والا جانیں لیکن نہ اس سے بُغض رکھیں اور نہ محبّت —— یا —— ہم کسی کو عظیم سمجھیں اور اس کے ساتھ ساتھ دل میں اس کی طرف سے بُغض بھی رکھیں۔ اگرچہ عرف و عادت کا تقاضہ یہی ہے کہ انسان جس کی عظمت کا اعتراف کرے اس سے محبت بھی کرے —— بایں ہمہ —— محبتِ نبوی نفسِ ایمان کے لئے نہ سہی، مگر کمالِ ایمان کے لئے یقیناً لازمی ہے۔ کیونکہ :

من لم یجد من نفسه ذالك المیل لم یکمل ایمانه۔

(فتح الباری و مواہب ناقلاً عن القرطبی)

جو اپنے نفس میں رسُول کی طرف وہ میلان نہ پائے گا وہ کامل الایمان نہیں ہو سکتا۔

فتح الباری، مواہب و زرقانی کا مذکورہ بالا خلاصہ ذہن نشین فرما کر آئیے میرے معروضات غور فرمائیے :

اوّلاً —— حضرت قاضی عیاض نے جس محبت کو ایمان کے لئے شرط قرار دیا ہے وہ نفس محبت ہے نہ کہ احبیت یعنی محبتِ راجحہ۔ اور یہ بھی بخوبی واضح کر چکا ہوں کہ یہ تو ہو سکتا ہے کہ رسُول کریم کی طرف میلانِ طبع تو ہو لیکن دیگر موانعات کے سبب آپ پر ایمان نہ ہو سکے، مگر یہ ناممکن ہے کہ آپ پر ایمان ہو لیکن آپ کی طرف میلانِ طبع نہ ہو۔

ثانیاً —— حضرت قاضی عیاض نے محبّت کو عظمت کا ہم معنی قرار نہیں دیا ہے بلکہ انہوں نے جس محبّت کو "محبّتِ اجلال و اعظام" کا نام

دیا ہے اس کا منشا یہ ہے کہ یہ ایک ایسی محبت ہے، محبوب کی تعظیم و توقیر جس کا تقاضہ ہے اور یہ ظاہر ہے کہ یہ تو ہو سکتا ہے کہ کسی کو عظیم سمجھا جائے لیکن اس کی محبت سے تہی دامن رہا جائے۔ لیکن یہ ناممکن ہے کہ کسی عظیم سے محبت کی جائے لیکن اس کے اجلال و اعظام سے خالی الاعتقاد رہا جائے۔

ثالثاً — حضرت عمر رضی اللہ تعالے عنہ کی محبت سے متعلق جو روایت ہے وہاں نفسِ محبت خارج از بحث ہے۔ بلکہ وہاں سارا کلام احبّیت یعنی محبتِ راجحہ سے متعلق ہے اس لئے کہ جس طرح حضرت عمر کبھی بھی رسول کریم کی عظمت و اعظمیّت کے اعتراف سے خالی نہیں تھے، اسی طرح آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نفسِ محبت سے بھی کبھی تہی دامن نہ تھے — المختصر — قاضی عیاض کے کلام سے میں نے جو کچھ سمجھا ہے، نہ تو وہ واقعیّت کے خلاف ہے اور نہ وہ اس روایت سے مجروح ہوتا ہے۔

ج :- محبتِ ابُوّت[۳] — یہ وہ محبت ہے جو بیٹے کو اپنے ماں باپ سے ہوتی ہے، اس کا تقاضہ یہ ہے کہ بیٹا ماں باپ کی تعظیم و توقیر کرے اور ان کے حقوق کو پامال نہ کرے۔

د :- محبتِ بُنوّت[۴] — یہ وہ محبت ہے جو ماں باپ کو اپنی اولاد سے ہوتی ہے۔ اس کا تقاضہ یہ ہے کہ ماں باپ اولاد پر ہمیشہ رحیم و شفیق رہیں۔ چونکہ بھتیجا بھی بیٹے ہی کے حکم میں ہوتا ہے اسی لئے یہ کہنا صحیح ہے کہ جناب ابو طالب کو میرے رسول سے جو محبّت تھی وہ محبّتِ بُنوّت ہی تھی۔ ذہن نشیں رہے کہ جس محبت کی بنیاد خونی رشتہ و تعلق پر ہو اس محبت

کا ایمان کا سبب بن جانا غیر ضروری ہے۔

۵ :۔ محبتِ اخوّت ۔ یہ وہ محبت ہے جو بھائی بہنوں کو اپنے بھائی بہنوں سے ــــــــ یا ــــــــ خاندان والوں کو اپنے خاندان والوں سے ــــــــ یا ــــــــ شہر والوں کو اپنے شہر والوں سے ــــــــ یا ــــــــ وطن والوں کو اپنے وطن والوں سے ــــــــ یا ــــــــ ملک والوں کو اپنے ملک والوں سے ــــــــ یا ــــــــ انسانیت کی بنیاد پر کسی انسان کو کسی دوسرے انسان سے ہوتی ہے وغیرہ وغیرہ۔

اس محبّت میں بھائی چارگی اور اپنے خاندان والا، اپنے شہر والا، اپنے وطن والا اور اپنے مُلک والا ہونے کی حیثیت ملحوظ خاطر رہتی ہے۔ یہ محبّت آپس میں خیر خواہی کی متقاضی ہے۔

۶ :۔ محبتِ وطنیّت ۔ یہ وہ محبت ہے جو اہلِ وطن کو اپنے وطن سے ہوتی ہے۔ اس کا تقاضہ یہ ہے کہ وطن کی حفاظت وصیانت کی جائے اور اس کی بقاء وارتقاء کے لئے جس ایثار کی ضرورت ہو اس سے پہلو تہی نہ کی جائے۔

۷ :۔ محبتِ زوجیّت ۔ یہ وہ محبت ہے جو میاں بیوی ہیں ایک کو دوسرے سے ہوتی ہے۔ اس کا تقاضہ یہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے حقوق کی نگہداشت رکھیں۔

۸ :۔ محبتِ اقامت ۔ یہ وہ محبت ہے جو گھر والوں کو اپنے گھر سے ہوتی ہے جس کا تقاضہ یہ ہے کہ گھر کی دیکھ بھال کی جائے اور اس کو اغیار

کی تخریب کاریوں سے محفوظ رکھا جائے۔

ط :۔ محبتِ مملوکیت۔ یہ وہ محبت ہے جو ایک مالک کو اپنے مملوک سے ہوتی ہے جس کا تقاضہ یہ ہے کہ اپنے مملوک کو ظالمانہ تصرّفات سے بچایا جائے۔

ی :۔ محبتِ لسانیت۔ یہ وہ محبّت ہے جو کسی انسان کو اپنی مادری زبان اور اپنے ادب سے ہوتی ہے جس کا تقاضہ یہ ہے کہ اپنی مادری زبان کی حفاظت کی جائے اور اس تہذیب و ادب کو آشوبِ روزگار سے بچانے کی مناسب صورتیں اختیار کی جائیں جس کی آغوش میں اپنی مادری زبان پروان چڑھی ہے۔

محبّتوں کی مذکورہ بالا دس قسمیں بطور مثال میں نے پیش کی ہیں، عقل و شعور کی روشنی میں غور کیجئے تو محبّت کے اور بھی بہت سے خانے بن سکتے ہیں جن میں حسن و احسان والوں اور خود اپنی جان کی محبّتیں خاص اہمیت رکھتی ہوئی نظر آئیں گی ——— یہ ساری محبّتیں یقیناً طبعی اور فطری ہیں۔ اس سے یہ نہ سمجھ لیجئے گا کہ کوئی محبّت غیر طبعی بھی ہوتی ہے۔ محبّت تو ہر ایک طبعی ہی ہوتی ہے۔ میں نے محض بطور تنبیہ ان تمام مذکورہ بالا محبّتوں کو طبعی اور فطری کہا ہے تاکہ ذہن کسی اور طرف نہ جائے۔ اور یہ بخوبی سمجھ لیا جائے کہ رسُول کریم کی کس طرح کی محبّت مطلوب ہے اور کن کن محبّتوں پر اس کو غالب و راجح ہونا چاہئے۔ جب مرجوح اور مغلوب محبّتوں کی اہمیت کو سمجھ لیا جائے گا تو پھر محبّتِ راجحہ کی عظمت و برتری کا کامل احساس ہو جائے گا اور پھر اُس محبوب کی بھی عظمت و شوکت کی کسی نہ کسی قدر

معرفت حاصل ہوگی۔

مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام
بتاریخ
20 نومبر 2011ء
بروز
اتوار
بعد نمازِ عصر
سالانہ عرس مبارک
حکیم اہلسنت حضرت
حکیم محمد موسیٰ امرتسری
رحمۃ اللہ علیہ
چشتی نظامی قادری
بمقام
مقابرِ چشتیاں
قبرستان حضرت میاں میر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ
اس بابرکت محفل
شرکت فرما کر سعادتِ دار
حاصل کریں
8044
الداعی الی الخیر
دارالفیض گنج بخش
55 - حکیم محمد موسیٰ روڈ گوالمنڈی
ریلوے روڈ حضرت لاہور